# تعلیم و تربیت

مارچ 2018









صفحہ نمبر 7



صفحہ نمبر 57



صفحہ نمبر 62



صفحہ نمبر 43

# تعلیم و تربیت

77 واں سال گیارھواں شمارہ

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

بچوں کا محبوب رسالہ

مارچ 2018ء


بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

حضرت عیسیٰ علیہ السلام تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ایک پہاڑ کی طرف جا رہے تھے۔ ایک آدمی نے بلند آواز سے پکار کر کہا۔ ''اے خدا کے رسولؑ! آپ اس وقت کہاں تشریف لے جا رہے ہیں۔ وجہ خوف کیا ہے؟ آپ علیہ السلام کے پیچھے کوئی دشمن بھی تو نظر نہیں آتا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''میں ایک احمق آدمی سے بھاگ رہا ہوں تو میرے بھاگنے میں خلل مت ڈال۔''

اس آدمی نے کہا: ''یا حضرت آپ کیا وہ مسیحا علیہ السلام نہیں ہیں؟ جن کی برکت سے اندھا اور بہرا شفایاب ہو جاتا ہے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا ہاں۔ اس آدمی نے کہا، کیا آپ علیہ السلام وہ بادشاہ نہیں ہیں جو مُردے پر کلامِ الٰہی پڑھتے ہیں اور وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔'' آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''ہاں۔''

اس آدمی نے کہا: ''کیا آپ علیہ السلام وہ ہی نہیں ہیں کہ مٹی کے پرندے بنا کر ان پر دم کر دیں تو وہ اسی وقت ہوا میں اڑنے لگتے ہیں۔'' آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''بے شک میں وہی ہوں۔''

پھر اس شخص نے حیرانگی سے پوچھا کہ: ''اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو اس قدر قوت عطا کر رکھی ہے تو پھر آپ علیہ السلام کو کس کا خوف ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''اس رب العزت کی قسم کہ جس کے اسمِ اعظم کو میں نے اندھوں اور بہروں پر پڑھا تو وہ شفایاب ہو گئے، پہاڑوں پر پڑھا وہ ہٹ گئے۔ مُردوں پر پڑھا وہ جی اٹھے۔ لیکن وہی اسمِ اعظم میں نے احمق پر لاکھوں بار پڑھا لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔''

اس شخص نے پوچھا: ''یا حضرت علیہ السلام یہ کیا ہے، کہ اسمِ اعظم اندھوں، بہروں اور مُردوں پر تو اثر کرے لیکن احمق پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ حالاں کہ حماقت بھی ایک مرض ہے۔'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: ''حماقت کی بیماری خدائی قہر ہے۔''

پیارے بچو! اس حکایت رومی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ احمق اور بے وقوفوں کی صحبت سے بچنا چاہیے۔

عزیز بچو اور ساتھیو! مارچ کا شمارہ پڑھ کر اپنی آراء اور تجاویز سے آگاہ کیجیے۔ آپ کی تنقید اور تجاویز ہمارے لیے اور رسالے کی بہتری کے لیے بہت اہم ہے۔ اپنا خیال رکھیے۔ آپ کے لیے اور پورے وطن کی سلامتی کے لیے بہت سی دعائیں۔

''پاکستان زندہ باد''

فی امان اللہ

ایڈیٹر

## اس شمارے میں



اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے


ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر

سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ ''تعلیم و تربیت'' 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پرنٹر: ظہیر سلام

مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔

ہیڈ آفس و شوروم: 81۔ ای/1، مین بلیوارڈ، گلبرگ، لاہور۔



خط و کتابت کا پتا

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔

UAN: 042-111 62 62 62 Fax:042-36278816

E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com

tot tarbiatfs@live com



پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)= 1000 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)= 2400 روپے۔

ایشیاء، افریقہ، یورپ (ہوائی ڈاک سے)= 2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے)= 2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 35 روپے



## باری تعالیٰ سے دعا

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لیے
اے دعا ہاں عرض کر عرش الٰہی تھام کے
اے خدا اب پھیر دے رخ گردشِ ایام کے
صلح تھی کل جن سے اب وہ برسرِ پیکار ہیں
وقت اور تقدیر دونوں درپے آزار ہیں
ڈھونڈتے ہیں اب مداوا سوزشِ غم کے لیے
کر رہے ہیں زخم دل فریاد مرہم کے لیے
رحم کر اپنے نہ آئین کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا
خلق کے راندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے
آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے
خوار ہیں بد کار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں
حق پرستوں کی اگر کی تو نے دل جوئی نہیں
طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں



## نعت رسول مقبول ﷺ

نہ ہو گا روزِ محشر کوئی چارہ یا رسول اللہ
مگر تیری شفاعت کا سہارا یا رسول اللہ
ادھر حکم خداوندی سے بخشے جائیں گے عاصی
جدھر بھی آپ کا ہو گا اشارا یا رسول اللہ
ہوا مغلوبِ جب دشمن تو "لاتثریب" فرمایا
نہیں ثانی زمانے میں تمہارا یا رسول اللہ
بھلا سارے زمانے میں ہم آخر کیوں نہ رسوا ہوں
نہیں قرآں میں لگتا دل ہمارا یا رسول اللہ
شفاعت پر لگائے آس اک مدت سے بیٹھا ہے
گنہگاروں میں اک عاصی تمہارا یا رسول اللہ



آغا شورش کاشمیری




# استقامت

حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفیؓ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! مجھے اسلام کی ایک ایسی بات بتا دیجیے (جس میں سب باتیں آجائیں اور) اس کے بعد آپ ﷺ کے علاوہ اور کسی سے یہ سوال کرنے کی مجھے ضرورت نہ رہے۔ آپ ﷺ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ”تم کہو: میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر قائم رہو۔“ (صحیح مسلم، کتاب الایمان:38)

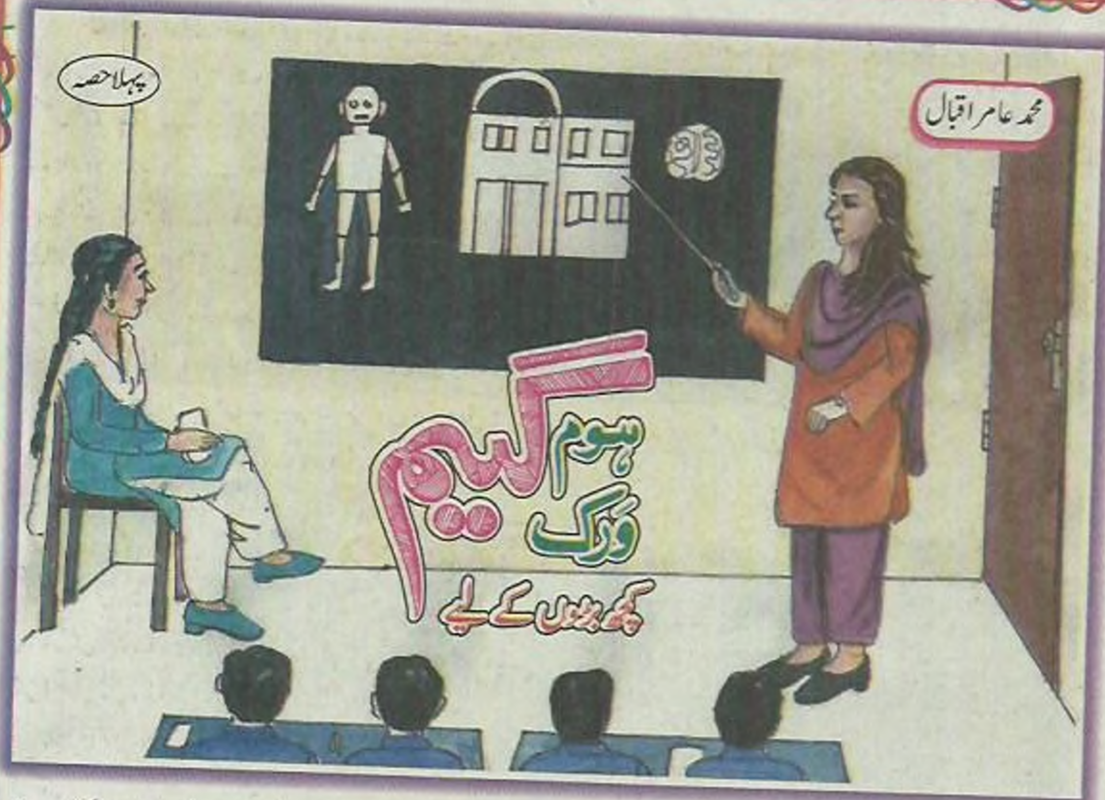
پیارے بچو! یہ ایک جامع نصیحت ہے، جو دین کے تمام شعبوں، تمام عقائد، تمام اعمال اور تمام طاعات میں شامل ہے۔ جب زبان سے اٰمنتُ باللّٰہ کہہ دیا کہ ”میں اللہ پر ایمان لایا“، اس میں تمام اسلامی عقائد کا ماننا آگیا۔ جب بندہ مؤمن ہو جائے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ ایمان کے مطالبات کو پورا کرے اور اسلامی صفات اختیار کرے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے انہیں بجا لائے اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے باز آجائے۔ جب بندہ ہر حال اور ہر موقع پر اللہ تعالیٰ کے حکموں کا دھیان رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کی دُھن رکھتا ہے اور ایمانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے تو وہ استقامت والا بن جاتا ہے۔ استقامت یعنی دین پر ثابت قدم رہنا، بڑی چیز ہے۔ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ ”استقامت ہزار کرامتوں سے افضل ہے۔“ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ ”(اے پیغمبر!) جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے، اس کے مطابق تم بھی سیدھے راستے پر ثابت قدم رہو۔“ (سورۃ ھود 112)

اس آیت میں استقامت کا ذکر فرمایا ہے، جس کا مطلب ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے مؤمن بندوں کو اپنے پیغمبروں اور کتابوں کے ذریعے جو راستہ بتایا ہے اس کو پوری طرح پکڑ لینا، ادھر ادھر مائل ہوئے بغیر اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کو پوری طرح بجا لانا اور آخر دم تک اس پر قائم رہنا۔ پھر استقامت اختیار کرنے والوں کو رب تعالیٰ کے ہاں کیا کچھ انعامات اور درجات ملتے ہیں؟ اس کے لیے قرآن پاک ہماری یوں راہ نمائی کرتا ہے: ایک جگہ ارشاد فرمایا: جن لوگوں نے کہا ہے کہ: ہمارا رب اللہ ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے تو ان پر بے شک فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اتریں گے: نہ کوئی خوف دل میں لاؤ، نہ کسی بات کا غم کرو، اور اس جنت سے خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ ہم دنیا والی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی تھے اور آخرت میں بھی تمہارے ساتھی رہیں گے، اور اس جنت میں ہر وہ چیز تمہارے ہی لیے ہے جس کو تمہارا دل چاہے، اور اس میں ہر وہ چیز تمہارے ہی لیے ہے جو تم منگوانا چاہو۔ یہ سب کچھ اس ذات کی طرف سے پہلی پہلی میزبانی ہے جس کی بخشش بھی بہت ہے، جس کی رحمت بھی کامل ہے۔ (سورۃ حم السجدۃ 30-32)

ان آیات مقدسہ سے معلوم ہوا کہ استقامت اختیار کرنے والوں کو درج ذیل انعامات ملتے ہیں: فرشتوں کا تین حالتوں میں خوش خبری دینا...... (1) موت کے وقت (2) قبر میں (3) قبر سے اٹھتے وقت، دل سے یہ خوف دور ہو جانا کہ میری نیکیاں قبول نہ ہوں گی، دل کا اس غم سے خالی ہونا کہ میں اپنے گناہوں میں پکڑ لیا جاؤں گا، پاکیزہ فرشتوں کی رفاقت، پاکیزہ فرشتوں کی مدد کا شامل حال ہونا، جنت میں داخلہ اور تمام فرمائشوں کا پورا ہونا، ہمیشہ کی جنت۔

پیارے بچو! استقامت (دین پر ثابت قدمی) بہت بڑی چیز ہے، اگر ہم اس پر قائم نہیں رہتے اور اسلام کے پاکیزہ اور سنہرے اصولوں سے ہٹ رہے ہیں تو ہمیں فوراً توبہ کرنی چاہیے اور ایمانی تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کرنا چاہیے۔

☆☆☆




''میں نے اسکول نہیں جانا۔ میں نے چھٹی کرنی ہے۔ امی پلیز مجھے چھٹی کرنی ہے۔'' جواد نے روز کی طرح روتے ہوئے کہا۔

''کوئی چھٹی وغیرہ نہیں۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ کل بھی تمہاری استانی صاحبہ پوچھ رہی تھی کہ یہ روز دیر سے کیوں آتا ہے۔'' جواد کی امی نے باورچی خانے میں سے آواز لگائی۔

''میں نے کہہ دیا ہے کہ مجھے چھٹی کرنی ہے تو کرنی ہے بس۔ وہاں ذرا مزہ نہیں آتا مجھے۔'' جواد نے باورچی خانے کے پاس آ کر کہا۔

''آج چلے جاؤ۔ تمہیں سردی کی چھٹیوں کا کام ملے گا۔ پھر ویسے ہی تمہیں چھٹیاں ہو رہی ہیں۔ چھٹیوں میں جو مرضی کرنا تم۔''

چھٹیوں کا سن کر جواد بُرا سا منہ بنا کر یونی فارم پہننے لگا اور دل ہی دل میں خوش ہونے لگا کہ چھٹیوں میں مزے اڑاؤں گا۔

''آج پھر جواد کلاس میں دیر سے آیا ہے۔ حالاں کہ پڑھائی میں اتنا اچھا ہے پھر اسکول لیٹ کیوں آتا ہے؟'' مس الفت نے جواد کی امی سے پوچھا۔

''میں خود بہت پریشان ہوں۔ یہ ہوم ورک اور اسکول آنے کے لیے ذرا بھی خوش نہیں ہوتا۔''

''کیوں جواد؟ ایسا کیوں؟'' مس الفت نے جواد کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''میں بور ہو جاتا ہوں۔ بس میرا دل چاہتا ہے کہ بہت سی گیمز ہوں، مجھے ویڈیوز کے ذریعے پڑھایا جائے اور پارک لے کر جایا جائے تا کہ وہاں میں خوب کھیلوں۔'' جواد نے معصومیت سے جواب دیا اور باہر کھیلنے کے لیے بھاگ گیا۔

''دیکھا! میں تنگ آ گئی ہوں یہ سن سن کر۔ پتا نہیں کہ اس کا مستقبل میں کیا بنے گا؟'' جواد کی امی نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

مس الفت مسکرائی اور اٹھ کر بلیک بورڈ پر تین تصویریں بنائیں اور کہا کہ اس کا حل ہے۔

''انسانی دماغ، اسکول اور روبوٹ! ان تین تصویروں کا اس معاملے سے کیا لینا دینا؟''

جواد کی امی نے تجسس سے پوچھا۔

''میں سمجھاتی ہوں۔ سب سے پہلے آپ انسانی دماغ کو سمجھیں۔ تجسس، انسانی دماغ میں فطری طور پر موجود ہے۔ اس لیے بچے چاہتے ہیں کہ وہ نئی نئی باتوں کی کھوج لگائیں۔ وہ نئے نئے جواب سیکھیں۔ نئے نئے سوال پوچھتے ہیں۔ وہ ہر روز کچھ سیکھنا چاہتے ہیں اور آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔''

''مگر یہ سب تو اسکول میں بھی ہوتا ہے۔ سوالات جوابات کھوج لگانا اور سیکھنا۔'' جواد کی امی نے فوراً کہا۔

''جی ہاں! مگر ان سب باتوں میں سے ایک بات آپ بھول گئی ہیں وہ ہے آگے بڑھنے کا محسوس ہونا۔ ہمارا دماغ مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے کوئی challenge ملے اور وہ اسے عبور کرے اور جب بھی ہم کوئی challenge عبور کرتے ہیں تو ہمارے دماغ سے ایک Chemical نکلتا ہے جسے "Dopamine" کہا جاتا ہے۔ "Dopamine" ہمیں نہ صرف اچھا محسوس کراتا ہے بلکہ اس کے نکلنے سے ہمیں تحریک (Motivation) ملتی ہے کہ ہم اور بھی مقاصد (Goals) حاصل کریں۔ ہم حیران ہوتے ہیں کہ بچوں کو گیمز کیوں پسند ہوتی ہیں؟ کیوں کہ انہیں اسی میں بہت سے Challenges پار کرنے ہوتے ہیں۔ اور ہر سطح (Level) یا Challenge کے پار کرنے پر انہیں انعام بھی ملتا ہے۔ لہٰذا وہ مسلسل گیم کھیلتے رہنا چاہتے ہیں تا کہ انعام بھی ملے اور وہ مسلسل آگے بڑھتے رہیں۔ مگر اسکول میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ ٹیسٹ پاس کرتے بھی ہیں تو مار کے ڈر سے۔ انہیں اسکول میں روزانہ آگے بڑھتے ہوئے محسوس نہیں ہوتا۔

جواد کی امی یہ سب سن کر حیرانی سے بلیک بورڈ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''دوسری تصویر یعنی اسکول۔ اسکول کچھ سو سال پہلے صرف اس لیے بنائے گئے تھے تا کہ بچوں کو تربیت دی جا سکے اور Train کیا جا سکے کہ وہ بعد میں فیکٹریوں میں نوکری کر سکیں۔ وہ وقت پر اسکول آئیں۔ حکم مانیں۔ ایک سے مضامین پڑھیں تا کہ وہ بعد میں نوکری کر سکیں۔ اب وقت بدل چکا ہے۔ اب فیکٹریوں میں نوکریاں انسان کی بجائے مشینیں کر رہی ہیں۔ جو کہ میں نے تیسری تصویر میں دکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ کتنے نوجوان بے روزگار گھوم رہے ہیں۔ بتانے کا مقصد ہے کہ آپ مستقبل کے لیے پریشان مت ہوں۔ آپ کوشش کریں کہ جواد ایک اچھا انسان بنے۔ جو مسائل کو حل کرنے میں دل چسپی رکھتا ہو۔ نئی نئی باتوں کی کھوج لگا پائے۔ رٹا لگا کر پاس نہ ہو۔ اب بچے کمپیوٹر سے پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ کیوں کہ رنگ برنگی تصاویر انہیں اچھی لگتی ہیں۔ ان سے تمام senses یعنی حسیں سیکھتی ہیں۔ تبھی جواد نے کہا کہ وہ پارک میں جانا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ ویڈیوز سے سیکھے۔

''تو اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' جواد کی امی نے پوچھا۔

''آپ کو ہوم ورک گیم بنانی چاہیے۔'' مس الفت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ ہوم ورک گیم کیا ہے؟'' جواد کی امی حیران ہو کر بولی۔

''مس الفت نے کہا کہ ہم ویسے تو اپنے اسکول میں اب طرح طرح کے نئے طریقے لا رہے ہیں تا کہ بچوں کا رجحان بنے۔ لیکن ''ہوم ورک گیم'' آپ گھر میں بھی کھیل سکتی ہیں۔

سب سے پہلے آپ ہاتھ سے یا کمپیوٹر کی مدد سے ایک رنگین سا چارٹ بنائیں اور اسے گھر میں نمایاں سی جگہ پر لگا دیں۔ چارٹ میں رنگین تصویروں کی مدد سے جواد کے ہر ہوم ورک کو ایک Challenge کے طور پر دکھایا جائے۔

مثال کے طور پر چیلنج نمبر 1 ہے قائداعظم پر مضمون یاد کرنا اور لکھنا سیکھنا۔ چیلنج نمبر 2 ہے کہ ایک سے لے کر 10 تک پہاڑے (Tables) یاد کرنا۔ چیلنج نمبر 3 ہے کسی بھی اچھی کتاب کے دو صفحات پڑھنا۔ چیلنج نمبر 4 ہے کہ روز ڈائری لکھنا۔ چیلنج نمبر 5 ہے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا۔ چیلنج نمبر 6 ہے نماز اور قرآن پڑھنا۔ اسی طرح آپ اسکول کے کام یا اچھی عادات کو چیلنج کی صورت میں چارٹ پر نمایاں کریں۔ اس کے بعد ہر چیلنج کو پورا کرنے پر ایک انعام رکھیں۔

یاد رہے کہ بنا انعام کے جواد کو تحریک (Motivation) نہیں ملے گی کہ وہ اگلے چیلنج کی طرف جائے۔ انعام چیلنج پورا کرنے کے فوراً بعد ملے۔ ہو سکے تو آپ سرپرائز (Surprize) بھی دے سکتی ہیں۔ جس میں کچھ زیادہ انعام ہو۔

انعام میں کچھ ایسا ہونا چاہیے جو کہ جواد کو اچھا بھی لگے اور اس کی بھلائی بھی ہو۔ مثال کے طور پر آپ ایک چیلنج ختم ہونے پر اسے پارک لے کر جا سکتی ہیں۔ دوسرے اسے چاکلیٹ دی جا سکتی ہے۔ اگر وہ ٹی وی دیکھنا چاہے تو کہا جائے کہ چیلنج پورا کرو تو تمہیں ٹی وی دیکھنے دیا جائے گا۔ اسی طرح کسی چیلنج پر ویڈیو گیم کھیلنے دی جائے تو کسی چیلنج پر اسے کلر بوکس (Color Box) دے دیا جائے۔ یاد رہے کہ انعامات پہلے سے نہ معلوم ہوں۔ تا کہ بچے میں تجسس میں رہے کہ نہ جانے اب کون سا انعام ملے گا۔ شروع میں زیادہ انعامات دینے سے اس کا لگاؤ اور عادت بنے گی۔ آہستہ آہستہ جب عادت بن گئی تو بنا انعام دیے بھی وہ کام کرے گا۔

واہ! یہ تو بہت اچھا طریقہ ہے میں اسے ضرور آزماؤں گی۔'' امی اب خوش نظر آنے لگیں۔

''ہمیں بہ طور استاد اور والدین بچوں کو نئے دور کے طور طریقے سیکھنے سے روکنا نہیں چاہیے۔ بلکہ ہمیں انسانی دماغ اور نئے طور

طریقوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان کی پرورش کرنی چاہیے۔ انہیں محنت کی عادت ڈالنی چاہیے۔ انہیں لگے کہ وہ جو انعام جیت رہے ہیں وہ قابلیت کی بنا پر جیت رہے ہیں۔ ہمیں انہیں جوابات یاد کرانے کی بجائے اچھے اچھے سوالات ڈھونڈ کر لانے کے لیے کہنا چاہیے۔ کیوں کہ سوالات کے جوابات تو ڈھونڈنا بہت آسان ہے لیکن سوالات کرنا یا ڈھونڈنا ایک مفید دماغی ورزش ہے۔"

مس الفت مسکراتے ہوئے بولی۔

"بہت بہت شکریہ۔ مجھے ان باتوں سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ میں ضرور اسے آزماؤں گی۔"

یہ کہہ کر جواد کی امی خوشی خوشی گھر کی جانب چل پڑیں۔ وہ خوش بھی تھیں اور پرجوش بھی کیوں کہ اب انہیں اکیسویں صدی میں کامیابی کا راز معلوم ہو چکا تھا اور جواد کا مسئلہ بھی ہونے جا رہا تھا۔



نوٹ: پیارے بچو! آپ بھی جوابات کی بجائے اچھے اچھے سوالات سیکھیں اور اپنے والدین اور اساتذہ کے ساتھ مل کر ان کے جوابات تلاش کریں۔ آپ سب بھی ہوم ورک گیم کو آزمائیں اور خط لکھ کر ہمیں بتائیں کہ آپ نے کتنے انعامات جیتے۔

☆☆☆

## اَلْبَصِیْرُ

(وہ دیکھ رہا ہے)

شہر میں ایک لڑکا رہتا تھا، وہ یتیم تھا۔ اتفاق سے اسے ایک ایسے آدمی نے پالا تھا، جو ایک چور تھا۔ اس نے اس یتیم بچے کے بارے میں سوچا کہ میں اپنے بچے کو پڑھاؤں لکھاؤں گا۔ تین چار سال بعد اس نے اس بچے کو دوسرے شہر میں پڑھنے بھیج دیا اور خود وہ چوریوں سے باز نہ آیا۔ تین چار سال بعد وہ اس بچے سے ملنے گیا اور پوچھا کہ اتنے عرصے میں تم نے کیا سیکھا۔ اس کے بچے نے کہا۔ "اَلْبَصِیْرُ" (وہ دیکھ رہا ہے) اس کے باپ کو غصہ آ گیا اور کہا کہ تم نے اتنے سالوں میں بس یہ ایک جملہ سیکھا۔ اتنے سالوں میں تو میں نے تمہیں چوریاں کرنے میں ماہر کر دینا تھا۔ چلو واپس چلیں۔ اب میں تمہیں سکھاتا ہوں کہ چوری کیسے کرتے ہیں۔ ایک دن وہ اپنے بیٹے کے ہمراہ چوری کرنے گیا۔ وہ کسی دکان پر جا کر تالا توڑنے لگا تو اپنے بیٹے کو کہا کوئی آئے گا تو بتا دینا جیسے ہی وہ تالا توڑنے لگا تو اس کے بچے نے کہا کہ ابا جان وہ دیکھ رہا ہے۔ اس کے باپ نے بچے کو ساتھ لیا اور تیزی سے بھاگنے لگا بہت دور گیا تو پیچھے مڑ کر دیکھا تو اپنے بیٹے کو کہا کہ وہاں تو کوئی بھی نہیں تم نے کس کو دیکھا۔ اس کے بچے نے کہا کہ ابا جان اَلْبَصِیْرُ (وہ دیکھ رہا ہے) کون دیکھ رہا ہے اس کے باپ نے پوچھا۔ بچہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ اس کا باپ ایک دم سے چونک اٹھا اور پھر فوراً اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لی اور چوری چکاری کا کام چھوڑ کر نیکیاں کرنے لگا اور اس بچے کو واپس اسی مدرسے میں بھیج دیا۔

پیارے بچو! اس کہانی سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہر برے اور اچھے کام سے پہلے ہمیں یہ ضرور سوچنا چاہیے اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے اور ہر چیز کو اور ہمارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ (انفعال زاہد، سیال کوٹ)

☆☆☆




بہت دنوں کا ذکر ہے کہ دلی کے خانم بازار میں ایران سے ایک عورت آ کر رہی۔ یہ عورت پرلے درجے کی مکار اور چالاک تھی۔ دلی میں ان دنوں ہر محلے میں بہت سے مکان خالی پڑے تھے۔ اس عورت 'شاہ خانم' نے ایک مکان کرایے پر لے لیا۔ جب اس کی تمام جمع پونجی ختم ہو گئی تو بازار والوں کو لوٹنے کا ارادہ کر کے اس نے محلے کے ایک بچے سے ڈولی منگوائی۔ گھر میں بڑے بڑے وزنی پتھر پہلے ہی سے موجود تھے۔ جیسے ہی ڈولی دروازے پر لگی۔ شاہ خانم نے پتھر ڈولی میں رکھنے شروع کیے اور......

خانم۔ "اے کہارو! ذرا منہ پھیر لو۔ ہماری بیگم صاحبہ ڈولی میں بیٹھ جائیں......"

کہار۔ "اچھا بی بی جی! ہم منہ پھیر لیتے ہیں۔ آپ بیٹھ جائیں۔"

خانم۔ "ہاں ٹھیک ہے۔ اچھا بھئی! اب جلدی چلو۔ نرائن داس جوہری کے ہاں سے ہمیں کچھ گہنے لینے ہیں۔"

کہار۔ "بی بی جی! چاوڑی بازار چلنا ہے نا......؟"

خانم۔ "(عجلت سے) ارے بھئی ہاں...... تم چلو تو......"

(اور تھوڑی ہی دیر میں شاہ خانم جوہری کے ہاں پہنچی۔ شاہ خانم چوں کہ پیدل آئی تھی اس لیے سیدھی دکان میں پہنچی) اور......

خانم۔ "بس بھئی کہارو! ڈولی یہیں لگا دو......"

نرائن۔ (کھڑے ہو کر استقبال کرتے ہوئے) "آیئے سرکار...... ادھر آیئے حضور...... اے...... یہاں تشریف رکھیے۔"

خانم (متوجہ نہ ہو کر) "اے بھئی کہارو!...... تم سے کہا نا کہ ڈولی یہاں رکھ دو۔ مگر تم سنتے ہی نہیں......"

نرائن (ہمدردی جتاتے ہوئے) "ابے کیا کر رہے ہو تم لوگ۔ ڈولی رکھ کیوں نہیں دیتے......"

کہار۔ "رکھتے ہیں سیٹھ جی!"

نرائن۔ "(بیچ میں) اچھا بکو مت۔ (انکساری سے ہاتھ باندھ کر) ہاں فرمایئے!...... میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

خانم (تحکمانہ لہجے میں) ہماری بیگم صاحبہ کو کچھ جڑاؤ گہنے چاہئیں...... سیٹھ جی...... اگر ہوں تو دکھایئے۔ یہی تکلیف دینے حاضر ہوئے ہیں۔"

نرائن "(جلدی سے) سرکار...... کیا بات کہتی ہیں۔ رام رام۔ تکلیف کی کیا بات ہے؟"

(شاہ خانم اب برقعے کا نقاب الٹ دیتی ہے اور اس کے تمام جڑاؤ گہنے جو وہ اس وقت پہنے ہوئی تھی، نرائن دیکھ کر حیران رہ

جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ جب نوکرانی ایسی ہے تو بیگم صاحبہ کا تو خدا ہی معلوم...... کہ کیا ہوں گی۔

نرائن۔ ''آپ بیگم صاحبہ کو اندر بلا لیجیے نا۔ دم گھٹ جائے گا۔ میں اتنے میں زیورات لاتا ہوں۔''

خانم۔ ''نہیں نہیں...... وہ وہیں ٹھیک ہیں۔ آپ زیورات لے کر آیئے۔''

نرائن سیٹھ (اندر جاتے ہوئے) ''ابھی حاضر ہوا سرکار!''

(وقفہ)

منیم (مال کو بکھرا ہوا دیکھ کر)۔ ''میں نے کہا۔ یہ اتنے زیورات کا کیا ہوگا...... سیٹھ جی!''

نرائن۔ ''ارے منیم جی! بڑی مال دار آسامی پھنسی ہے۔ بھگوان قسم!...... (چٹکی بجاتے ہوئے) وہاں ماروں گا جہاں اس کو پانی بھی نہ ملے۔ آؤ باہر آؤ۔ (باہر آ کر) اے...... یہ لیجیے...... پہلے یہ جھمکے دیکھیے! یہ جھلنیاں ہیں۔ ذرا اس کی زنجیر ملاحظہ فرمایئے۔ بھگوان قسم! فرصت میں بیٹھ کر بنایا ہے کاری گر نے۔ بس آپ لوگوں کے لیے بنا ہے جو سچ پوچھو۔'' ''کیوں منیم جی!''

منیم۔ ''ہاں سیٹھ جی!''

نرائن۔ ''اور یہ دیکھیے۔ یہ ہیں پونچیاں یعنی امیروں کی جان۔ غریبوں کا ایمان۔ ہاتھوں کی زینت۔ عورتوں کی عزت......''

منیم (بیچ میں) ارے حضور! یہ وہ چیز ہے جس کے متعلق بڑے بڑے شاعر بھی شعر لکھ گئے ہیں۔''

خانم ''(ہنستے ہوئے) سیٹھ جی! میرا خیال ہے کہ آپ تمام چیزیں مجھے دے دیں۔ میں بیگم صاحبہ سے پسند کرا لوں۔''

نرائن۔ ''ہاں ہاں! ٹھیک ہے۔ کیوں منیم جی؟''

منیم۔ ''ہاں سیٹھ جی!''

(شاہ خانم تمام چیزیں ڈولی میں لے جاتی ہے اور خواہ مخواہ اپنے آپ ہی سوال کرتی ہے اور خود ہی جواب دیتی ہے...... زیورات کی گٹھڑی باندھ کر ڈولی میں رکھتی ہے...... اور......

خانم۔ ''بھئی سیٹھ جی! ہماری بیگم صاحبہ تجوری تو لیتی آئیں۔ مگر کنجی وہیں پٹاری میں رہ گئی ہے۔ اس لیے ہم جاتے ہیں۔ پھر کبھی آئیں گے۔

نرائن (بے تابی سے) ''ارے حضور! کیا غضب کرتی ہیں۔ ہیں۔ میں اتنا گستاخ نہیں کہ اعتبار نہ کروں۔ یوں کیجیے کہ چیزیں لے جایئے اور کنجی لیتی آیئے۔ کیوں منیم جی؟''

منیم۔ ''ہاں سیٹھ جی!''

خانم (ڈولی میں سے گٹھڑی لیتے ہوئے) ''بیگم صاحبہ میں ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔ بھئی کہارو! یہیں کھڑے رہنا۔ سیٹھ جی! ذرا بیگم صاحبہ کا خیال رکھنا۔''

نرائن (لجاجت سے) ''کیا بات کرتی ہیں آپ۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ بیگم صاحبہ کو اندر بلا لیجیے۔ مگر آپ مانی ہی نہیں۔ کیوں منیم جی؟''

منیم۔ ''ہاں سیٹھ جی۔''

(کافی دیر ہوگئی۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ لیکن شاہ خانم واپس نہ آئی۔ اب تو یہ دونوں بڑے پریشان ہوئے اور......)

نرائن۔ ''بیگم صاحبہ۔ حضور بیگم صاحبہ۔''

منیم۔ ''میں نے کہا۔ حضور بیگم صاحبہ! وہ...... وہ۔''

نرائن۔ ''وہ آپ کی خادمہ ابھی تک نہیں آئیں...... بیگم صاحبہ۔''

منیم۔ ''یہ آپ بولتی کیوں نہیں۔''

نرائن (پریشان ہوکر) ''ارے منیم جی! ذرا پردہ اٹھا کر تو دیکھو۔''

منیم (پردہ اٹھا کر روتے ہوئے)

''ارے سیٹھ جی مر گئے...... ہائے مر گئے سیٹھ جی...... یہاں تو معاملہ خالی ہے۔''

نرائن (حد درجہ پریشانی اور غصے سے) ''ابے ابے کہارو! ابے کہارو کے بچو! یہ بلا کہاں سے لائے تھے تم؟ اب ہم لٹ گئے۔ برباد ہو گئے۔ چلو چلو بتاؤ کہاں سے اس کم بخت کو لائے تھے۔''

(کہاروں نے اب وہ مکان دونوں کو لے جا کر دکھایا مگر وہاں اب کیا رکھا۔ مکان خالی پڑا......)۔

شاہ خانم جب لوگوں کو لوٹتے کھسوٹتے تھک گئیں اور جب انہیں اپنے پکڑے جانے کا ڈر ہوا تو انہوں نے دلی کے ایک محلے کی تنگ سی گلی میں بود و باش اختیار کی۔ شاہ خانم اب اس مکان میں آنند کے تار بجاتیں۔ نہ انہیں پولیس کا ڈر تھا نہ لوگوں کا۔ پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں والا مضمون تھا۔ مگر

جمع شدہ پونجی آخر چلتی تو کب تک؟ انہوں نے اپنی ہمسائی قاضی جی کی بیوی سے راہ و رسم بڑھائی اور رفتہ رفتہ ان کے ہاں آنا جانا شروع کر دیا۔

ایک دن جو وہ ہمسائی کے ہاں پہنچیں تو وہ اپنی مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھیں اور ''کڑی کڑی کڑی۔'' کہہ کر انہیں دور بھگا رہی تھیں......

''سلام بوا......'' خانم نے کہا۔

''آؤ بہن...... بیٹھو......'' ہمسائی نے اندر والان میں آتے ہوئے کہا۔

خانم گاؤ تکیے سے سہارا لگا کر بیٹھ گئیں۔ یوں تو وہ ہمسائی کو اپنی عیارانہ شطرنج کا ایک مہرہ کبھی کا بنا چکی تھیں۔ مگر چال انہوں نے آج ہی چلنی چاہی اور تختۂ مشق اسی مہرے کو بنایا...... بولیں:

''اے ہمسائی! کیوں ان کے ساتھ ناحق دماغ لڑا رہی ہو بے کار......!!''

''کیا بتاؤں بوا!'' ہمسائی نے کہا۔ ''شوقوں میں صرف یہی موا ایک شوق ہے۔ ایک سے ایک اچھی مرغی گھر میں موجود ہے۔ کلو کے ابا جہاں کوئی اچھی نسل کی دیکھتے ہیں، لے آتے ہیں۔ انڈا بھی ماشاء اللہ...... یہ بڑا ہوتا ہے۔''

''ہاں......!! خانم نے ہاں لمبی کھینچ کر اور ذرا حیرت سے کہا:

''اور نہیں تو کیا...... مگر بہن! ان کم بختوں نے تمام گھر سڑا کر رکھ دیا ہے۔ جدھر دیکھو بیٹ۔ جدھر دیکھو بیٹ۔ نوج......! میں تو تنگ آ گئی...... ہمسائی نے منہ بنا کر جواب دیا۔

''ہاں بوا! یہ تو بری بات ہے۔'' خانم نے کہا۔ ''مگر دیکھو...... ایک بات کہتی ہوں۔ برا مت ماننا۔ تمہاری مرغیاں کچھ تہذیب یافتہ نہیں ہیں۔''

''ارے بی واہ......! کہیں مرغیاں بھی تہذیب یافتہ ہوئی ہیں۔ آخر جانور ہی تو ہیں۔'' ہمسائی نے کہا۔

''لاکھ جانور سہی۔ مگر انہیں کم از کم میری مرغیوں کی طرح تو ہونا چاہیے تھا۔'' خانم نے کہا۔

''تمہاری مرغیاں ایسی کیا انوکھی تھیں؟'' ہمسائی نے پوچھا۔

''واہ انوکھی کی بھی ایک ہی رہی۔ ارے بی! ایک جگہ پانی پیتی تھیں۔ ایک جگہ بیٹ کرتی تھیں۔ ایک جگہ سوتی تھیں۔ جو کہو وہ مانتی تھیں۔'' خانم نے جواب دیا۔

''ا...... بی جاؤ...... مذاق کرتی ہو......'' ہمسائی بولیں۔

''اللہ قسم...... اور یہی نہیں۔ بلکہ ناچ اور گانا بھی گاتی تھیں۔'' خانم نے کہا۔

''واقعی؟'' ہمسائی نے حیرت سے پورا منہ کھول کر کہا۔ اے واقعی کیا سچ ہے؟''

''جھوٹ بولنے کے لیے بوا کوئی تم تھوڑی ہی ہو...... عالم آرا میں جو وہ سہیلیاں مل کر ناچتی ہیں نا۔ وہ ڈانس میں نے ان کو سکھایا تھا۔ اے ہے جب تھرک کر ناچتی تھیں۔ تو جی چاہتا تھا کہ قربان ہو جاؤں ان سب پر سے۔'' خانم نے ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

''اے بی ہوش کی دوا کرو۔ بے چاری مجھ کو بنا رہی ہیں......'' ہمسائی نے کہا۔

''خیر بوا! اگر تم کو یقین نہیں آتا تو نہ سہی لیکن اگر تمہاری مرغیاں بھی ویسی ہی ہو جائیں۔ تب تمہیں یقین آئے گا۔'' خانم نے جواب دیا۔

''ارے سچ!...... تمہیں خدا کی قسم! کیا میری مرغیاں بھی ویسی ہی ہو جائیں گی؟'' ہمسائی نے خوشی کے لہجے میں کہا۔

''کیوں نہیں۔'' خانم نے جواب دیا۔ ''چند مہینوں میں سیکھ جائیں گی۔ میری ایک مرغی جس کا پیار کا نام لیلیٰ تھا ۔

''حق کے پیارے امت والے

تم پر لاکھوں سلام!''

ایسی عمدہ طرز میں گاتی تھی کہ دروازے پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے اور لوگوں کی چیخیں نکل جاتیں۔ دو دو تین تین لاکھ روپے لوگ اس کی قیمت دینے کو تیار ہو گئے۔ مگر بوا میں نے نہیں دی۔''

اب بی ہمسائی شاہ خانم کے سر ہو گئیں کہ میری مرغیوں کو بھی ناچ گانا سکھا دو۔

شاہ خانم نے ہامی بھر لی اور بولیں:

''مگر بہن! ایسے تھوڑے ہی ہوں گی۔ ارے بھئی! دو بوریاں روے میدے کی۔ ایک بوری قند (چینی، شکر) کی اور کم از کم آٹھ کنستر گھی کے تو ضرور ہونے چاہئیں۔ روزانہ محنت کروں گی۔ ملیدہ بناؤں گی اور انہیں کھلاؤں گی۔ جب ان میں جان آئے گی اور تبھی ان کی آواز بھی کھلے گی۔''

ہمسائی پہلے تو بوریوں والے مضمون کو سوچتی رہیں۔ بالآخر خوش ہو کر بولیں۔ ''آنے دو کلو کے ابا کو۔ ان سے کہہ کر کل ہی بوریاں بھجوا دوں گی۔ مگر بوا مرغیاں تم آج ہی لے جاؤ۔ بعد کو جھک جھک ہو گی۔ تمہاری بڑی عنایت ہو گی۔ یہ احسان مرتے دم تک نہ بھولوں گی۔''

خانم نے اس خیال سے کہ کہیں ہمسائی تاڑ نہ جائے پہلے تو بہت انکار کیا۔ سر کے درد کا بہانہ کر کے ٹالنا چاہا۔ آخر بڑی رد و کد کے بعد مرغیاں اپنے گھر لے گئیں۔

ہمسائی کے میاں نے جب یہ سنا تو بڑا حیران ہوا۔ لاکھ سمجھایا۔ آخر تریاہٹ سے مجبور ہو کر بوریاں لا دیں اور یہ سب کچھ شاہ خانم کے ہاں پہنچ گیا...... بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا......

شاہ خانم کا اب یہ معمول ہو گیا کہ ہر دوسرے دن ایک مرغی کاٹی۔ روے میدے کے پراٹھے بنائے۔ کچھ ملیدہ بنایا اور چٹ کر گئیں۔ ہر ہفتے وہ ہمسائی کے پاس جاتیں اور اپنی کارگزاری کی داستان سناتیں کہ اتنی محنت کر رہی ہوں۔ سر میں درد ہو جاتا ہے بولتے بولتے اور ایسی ہی ہزار باتیں......

غرض جب تین چار مرغیاں رہ گئیں تو ایک دن ہمسائی کے پاس پہنچیں۔ ہمسائی نے خوب آؤ بھگت کی اور ڈرتے ڈرتے اپنی مرغیوں کے بارے میں پوچھا۔ خانم بولیں: ''کیا بتاؤں بہن! میں تو عجیب مشکل میں پھنس گئی۔''

''کیوں کیا ہوا، خیر تو ہے؟ ہمسائی نے پاندان کھولتے ہوئے کہا۔''ہاں ویسے تو خدا کا احسان ہے۔ مگر تمہاری مرغیوں کی وجہ سے میں تم سے سخت شرمندہ ہوں۔'' خانم نے کہا۔

''کیا مر گئیں سب......؟'' ہمسائی نے حیرانی سے پوچھا۔

''نہیں بی۔ بڑی موئی تازی ہو رہی ہیں۔ ناچتی بھی ہیں۔ گاتی بھی ہیں۔''

''سچ! اچھا کیا گاتی ہیں؟'' ہمسائی نے خوش ہو کر کہا۔

''بس یہ مت پوچھو۔''

ہمسائی جھینپ کر بولی: ''اے بوا! ایسی کیا بات ہے جو تم شرما رہی ہو؟''

''کیا کہوں بی...... بس اتنی بری بات گانے میں کہتی ہیں کہ میری تو زبان کٹ جائے نہیں کہوں گی۔''



''اے بھئی! تو آخر کیا کہتی ہیں؟'' ہمسائی نے پوچھا۔

''اے بتاؤ نا۔ تمہیں خدا کی قسم! بھئی آخر گالی بکتی ہیں؟ کوسنے دیتی ہیں؟ کیا کہتی ہیں؟''

''اے بی ہاں بس......'' خانم نے اور جھینپ کر کہا۔

''بس کیا؟'' ''اگر کہہ دوں تو تم کسی کو بھی گھر میں نہ رکھو اور میں یہ چاہتی نہیں۔'' خانم آخر بولیں۔

''نہیں بی! تم صاف کہہ دو۔ اگر واقعی کچھ بری بات کہتی ہیں تو میں ایک موئی کو بھی گھر میں نہ آنے دوں گی۔ بس اب جلد کہہ چکو ورنہ مجھے ہول اٹھنے لگے گا۔'' ہمسائی بے چین ہو کر بولیں۔

''کہتی ہیں کہ......'' چپ ہو گئیں۔

''ہاں ہاں......!'' ہمسائی نے کہا۔

خانم بولی۔ ''یہی کہتی ہیں ناچ ناچ کر...... کہ ۔

تاک دھنا دھن تاک ۔ تاک دھنا دھن تاک

قاضی جی بدمعاش ان کی بیوی بھی بدمعاش

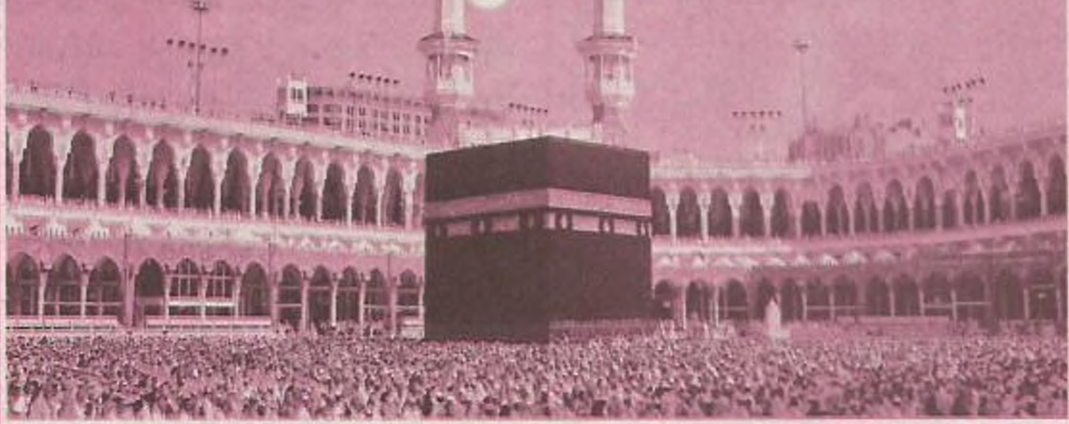
''اوئی اللہ!'' ہمسائی نے سینے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔

''نوج بوا! ان کم بختوں کو یہاں مت لانا۔ سب کا ٹیٹوا دبا دینا۔ پر نوج ڈالنا نگوڑیوں کے۔ اللہ ماریاں اتنی بری بات کہتی ہیں۔ نا بابا ہم تو کہیں کے نہ رہیں گے۔ کسی نے سن لیا تو کیا کہے گا۔ بس آج ہی ان سب کو کاٹ ڈالو۔ یہاں ان کا کام نہیں۔

لو بوا! یہ اچھی رہی۔'' خانم تو خدا سے یہی چاہتی تھیں۔ برقع اٹھا یہ جا وہ جا۔ ☆☆☆

# پیارے اللہ کے پیارے نام

راشد علی نواب شاہی



## اَلشَّھِیْدُ جَلَّ جَلَالُہٗ

(ایسا حاضر ہے جو سب کچھ دیکھتا اور جانتا ہے)

اَلشَّھِیْدُ جَلَّ جَلَالُہٗ وہ ہے جو اپنے بندوں کے تمام کاموں کو دیکھتا ہے۔ اپنے بندوں کی ہر بات اس کے پاس محفوظ ہے۔ وہ سارے رازوں سے بھی واقف ہے اور پوشیدہ باتیں بھی اس کو معلوم ہیں۔

یہ مبارک نام قرآن کریم میں 18 مرتبہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر بات سے باخبر ہے۔ اگر کوئی ظالم کسی پر ظلم کرتا ہے تو مظلوم تنگ دل نہ ہو، اللہ تعالیٰ مظلوم کی مدد ضرور کرے گا۔ اور ظالم مطمئن نہ ہو، اسے ظلم کرنے کی سزا ضرور ملے گی۔ اللہ تعالیٰ کائنات کے ذرے ذرے سے واقف ہے۔

اَلشَّھِیْدُ جَلَّ جَلَالُہٗ کا ایک مطلب گواہ بھی کیا گیا ہے۔ گواہ پر ایک خوب صورت واقعہ حدیث شریف کی کتابوں میں آیا ہے۔ آیئے! واقعہ پڑھتے ہیں۔

### گواہ

برسوں پرانی بات ہے۔ ایک شخص نے کسی دوسرے شخص سے ایک ہزار دینار قرض مانگا۔ قرض دینے والے نے کہا: ''تم گواہ لاؤ، تاکہ میں اسے گواہ بنالوں کہ تم نے قرض لیا ہے، ایسا نہ ہو کہ تم مکر جاؤ۔'' قرض مانگنے والے نے کہا۔ ''یہاں تو میں مسافر اور پردیسی ہوں۔ میرا تو کوئی جاننے والا نہیں ہے، بس اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے۔''

قرض دینے والے نے کہا۔ ''کوئی ضامن لے آؤ، ایسا نہ ہو کہ تم قرض ادا نہ کرو تو اس ضامن سے تو اپنا قرضہ لے سکوں۔''

قرض مانگنے والے نے کہا۔ ''اللہ ہی میرا ضامن ہے۔'' بالآخر قرض دینے والے نے قرض دے دیا۔ قرض لینے والا اپنے کسی کام سے سمندر سفر پر گیا۔ پہلے زمانے میں سمندری راستوں کے ذریعے سفر ہوتے تھے۔ وقت مقررہ پر اسے کوئی کشتی نہ ملی۔ اس نے قرض دینے والے سے کہا تھا کہ میں سفر پر جا رہا ہوں۔ اس روز آ کر تمھیں ہزار دینار دے دوں گا۔ کشتی نہ ملنے کی وجہ سے وہ پریشان ہوا کہ اب کیا کیا جائے۔

چناں چہ اس نے ایک بڑی سی لکڑی لی، اسے اندر سے کھوکھلا کیا اور ہزار دینار اس میں رکھ دیے اور ایک خط بھی رکھا اور اسے اچھی طرح سے بند کر کے سمندر پر آ گیا اور یہ دعا کی:

''اے اللہ! آپ جانتے ہیں کہ میں نے فلاں آدمی سے ہزار دینار قرض لیے تھے۔ اس نے مجھ سے ضامن مانگا تو میں نے کہا۔ ''میرا ضامن اللہ تعالیٰ ہے۔'' وہ آپ کی ضمانت پر راضی ہو گیا اور اس نے گواہ کا مطالبہ کیا تو میں نے کہا۔ ''میرے لیے اللہ تعالیٰ ہی گواہ کے طور پر کافی ہے۔'' وہ آپ کی گواہی پر راضی ہو گیا اور میں نے اب بہت کوشش کی کہ کوئی ایسی سواری ڈھونڈوں جس کے

ذریعے اس کا قرض اس تک پہنچا سکوں، لیکن میں اس میں کامیاب نہ ہوا اس لیے اب میں اس قرض کی حفاظت آپ کے ہی سپرد کرتا ہوں۔"

یہ دعا کر کے اس نے لکڑی سمندر میں پھینک دی۔ دوسری طرف قرض دینے والا وقت مقررہ پر اس جگہ آیا جو طے کی گئی تھی، مگر وہاں کوئی نہ آیا۔ وہ اپنے قرض سے مایوس ہو کر واپس جانے ہی والا تھا کہ اچانک اسے ایک لکڑی دکھائی دی، اس نے وہ اٹھا لی کہ چلو گھر پر جلانے ہی کے کام آئے گی۔ گھر آ کر جب لکڑی کو چیرا تو اس میں سے ہزار دینار اور ایک خط نکلا۔

کچھ دنوں کے بعد وہی شخص ہزار دینار لے کر آیا اور کہنے لگا:
"اللہ کی قسم! میں مسلسل کشتی کی تلاش میں رہا، مگر ناکام رہا۔"
اور پھر قرض دینے والے نے وہ واقعہ بتایا کہ تمہاری امانت مجھ تک پہنچ گئی ہے۔

## یاد رکھنے کی باتیں

1- اس مبارک نام سے ہمیں ایک سبق تو یہ ملا جسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس جگہ نہ دیکھے جہاں اس نے منع کیا ہے اور وہاں سے غائب نہ پائے جہاں موجود ہونے کا حکم دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن نیکیوں کا حکم دیا ہے عمل کے وقت وہاں سے غائب نہ ہوں اور جن گناہوں سے بچنے کا حکم دیا ہے وہاں پر نہ جائیں اور ان میں مشغول نہ ہوں۔

2- جب اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہے ہیں تو ہم جھوٹ بولنے سے بچیں، اسی طرح غیبت، چغل خوری، گالم گلوچ، لڑائی جھگڑا اور بے جا غصے سے بھی بچیں۔

3- جب ہم کسی بات کی گواہی دیں تو ٹھیک ٹھیک بالکل صحیح دیں، جو واقعہ ہوا ہے صرف اس کی گواہی دیں۔ اپنی طرف سے کوئی بات شامل نہ کریں۔

☆☆☆

## رحم دل حکم ران

یہ آج سے بہت سال پہلے کی بات ہے۔ شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ 107ء اور غالباً اگست کا مہینہ تھا۔ سلطان الپ ارسلان اور ان کا لشکر ملازگرد کے سامنے آ کر ٹھہرا۔ ان کے سامنے تجربہ کار بازنطینی لشکر ایک سیسہ پلائی دیوار کی طرح بے چینی سے منتظر تھا۔ پل بھر میں زمین کو پلٹ دینے والا، پل بھر میں آسمان کو ہلا دینے والا۔ لاکھوں فوجی اور ایسے منظم کہ جیسے ایک رسی میں بندھے ہوں۔ سفید ایال والے، سرخ دموں والے، کالی چمڑی والے گھوڑوں پر سوار گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے۔

اتنے میں آل سلجوق کے نام پر حکمران الپ ارسلان جو کہ سمندروں اور خشکیوں کی ہفت اقلیم کے اور تمام عالم اسلام کے عظیم راہ نما تھے۔ کفن انہوں نے پہنا ہوا، آسمانی بجلی کی طرح کڑکتے ہوئے، ہوا سے تیز رفتار گھوڑے پر سوار، تلوار لہراتے ہوئے اپنے لشکر کے سامنے آئے۔ آواز ایسی گرج دار جو میدان جنگ کے کونے کونے میں گونجے اور پھر انہوں نے لشکر سے خطاب کیا۔

"بہادرو! آج اس میدان میں اللہ عزوجل کے سوا کوئی سلطان نہیں۔ وہ خدائے واحد ہے جو تمہارے مال و متاع کا اور جانوں کا اور کل کائنات کا مالک ہے۔ آج یہاں جب تمہاری تلواریں دشمن کے خون سے اپنی پیاس بجھائیں گی، اگر کوئی جنگ نہیں کرنا چاہتا تو وہ آزاد ہے لیکن اگر کوئی مال غنیمت کی لالچ میں اپنی تلوار چلائے گا یا وہ جو نفس سے مغلوب ہو کر شہرت کے لیے اپنی شمشیر کے جوہر دکھائے گا، جو اپنی طاقت کے تکبر میں سر قلم کرے گا، وہ سب لوگ ہم میں سے نہیں کیوں کہ ہمارا مقصد تو فقط رضائے الٰہی ہے۔ ہماری نیت تو اسلام کا پرچم دنیا بھر میں لہرانا ہے۔"

میدان جنگ میں یہ ولولہ انگیز خطاب سن کر سارے لشکری ایسے جوش میں آ گئے کہ ہر طرف بس اللہ کے شیروں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اللہ، اللہ کے نعروں سے گنبد فلک بھی جوش میں آ گیا جسے ہم جیسا ناقص العقل بیان کر سکتا ہے نہ اس کی تعریف کر سکتا ہے۔ جنگ کے میدان میں گھوڑے ہنہنائے، شمشیروں نے ہزاروں کے ٹکڑے کر دیے۔ سب دشمن واصل جہنم ہو گئے۔ کتنی ہی لاشیں پکی فصل کی طرح زمین پر بچھ گئیں۔ کتنے ہی بہادر شہادت کے مرتبے پر فائز ہو گئے۔ فتح حق پر یقین رکھنے والے عادل کی لشکر کی ہوئی۔ تکبر، ظلم اور فتنے کی فوج تتر بتر ہو گئی۔ شکست خوردہ رومی لشکر کے سپہ سالار ڈومانوس کو گرفتار کر کے گھٹنوں کے بل بٹھا دیا گیا۔ سلطان الپ ارسلان نے خوف سے لرزتے ہوئے سپہ سالار کی طرف دیکھا اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور کہا کہ "تم ہمارے مہمان ہو۔" نہ اس پر کوئی ظلم کیا اور نہ اس کی تحقیر کی۔ کچھ مدت مہمان رکھنے کے بعد اسے واپس فرانس بھیج دیا۔ (مریم خانم، مانسہرہ)



# مختصر مختصر



## ہمسائے کا احترام

ہمسائے کا کرے گا جو بھی احترام
وہ اللہ سے پائے گا اس کا انعام
رسول اکرم ﷺ نے یہ سب سے کہا
کرو ہمسائے کا ہمیشہ اکرام
سکون اور راحت جو چاہتے ہو تم
تو ہمسائے کو دینا کبھی نہ آلام
یہ رشتہ خدا نے بنایا عظیم
سمندر سے گہرا ، ہمالہ سے بام
ہمسائے کو ستائے گا جو بد کلام
تو دوزخ ہی ہو گا اس کا انجام
یہ پیغام ہر سو پھیلا دو عظیم
ہمسائے سے محبت کا جنت مقام

(عظیم الرحمن صدیقی، لاہور)

## کرنیں

☆ توبہ کرنا آسان مگر گناہ چھوڑنا مشکل ہے۔
☆ لوگوں کے کام آنا اصل زندگی ہے۔
☆ حسد اور گھمنڈ جب آدمی کے اندر داخل ہوتے ہیں تو وہ عقل کو باہر کر دیتے ہیں۔
☆ ریت کے بکھرے ہوئے ذروں کو ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں مگر ریت کے ذرے جب مل کر پہاڑ بن جائیں تو کوئی بھی طوفان ان کو ہلانے میں کام یاب نہیں ہوتا۔

(محمد ہمایوں انوار، جھنگ صدر)

## انسان

اے انسان سوچ تو کون ہے؟ اگر دوسرے تیری باتوں میں نہیں آتے تو نہ سہی تو خود تو اپنے آپ میں جھانک۔ اگر تو نے اپنے آپ کو بدل لیا تو پھر بھی دنیا میں کم از کم ایک فرد سنور گیا۔ اس طرح خود کی اصلاح کرنے سے اصلاح شدہ کی جمعیت ہو جائے گی۔ اے انسان جب تو دنیا میں آیا تو رو رہا تھا اور دوسرے ہنس رہے تھے۔ مزا تو پھر ہے جب تو دنیا سے جائے تو دوسرے رو رہے ہوں اور تو ہنس رہا ہو۔ اے انسان مصیبت آنے پر پریشان نہ ہو۔ تیرا رب اس سے بھی بڑھ کر دکھ دے سکتا ہے۔ تو کیا کرے گا۔ پس اپنے رب سے ڈر کسی حال میں بھی اس سے غافل نہ ہو۔

(جاوید اقبال طور، جلال پور جٹاں)

## سنہری باتیں

☆ احسان کا بدلہ اتارنے کی طاقت نہ ہو تو زبان سے شکریہ ضرور ادا کرو۔
☆ نیکی پر غرور کرنا نیکی کے اجر کو ضائع کر دیتا ہے۔
☆ گناہ پر پشیمان اور شرمندہ ہونا گناہ کو مٹا دیتا ہے۔
☆ رنج کے بغیر راحت اور غم کے بغیر خوشی کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔
☆ غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھو۔

(بدرالرحمان، تحصیل جتوئی)

## بٹر فلائی

کہتے ہیں مجھے بٹر فلائی
میں ہوں پھولوں کی شہزادی
خوشبوؤں کو سونگھتی ہوں میں
بڑے ملائم ہیں پر میرے
اڑتی ہوں میں پھولوں پر
ہر کلی غنچے پہ ہوتی ہوں میں
پنکھ ہلاتی پیاری لگتی ہوں
کوئی بچہ مجھے پکڑے ناں
کوئی چاہے مجھ سے ملنا ملانا
دیکھ کے بچوں نے تالی بجائی
گلستان میں اڑنے کی آزادی
پھولوں کا رس چوستی ہوں میں
ریشم جیسے پر میرے
جیسے بچے جھولوں پر
پھولوں پر سوتی ہوں میں
ادھر ادھر اڑتی پھرتی ہوں
دیکھنا پر میرا اکھڑے ناں
ساجد کے ساتھ گلشن آ جانا

(ساجد کمبوہ، پھول نگر)

## جیسا کرو گے ویسا بھرو گے

کبھی کسی کو خوشی دے کے خوشی واپس نہ لینا کیوں کہ انسان کا دل بہت نازک ہوتا ہے جو کانچ کی طرح ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے وہ بھی آپ کی طرح ایک انسان ہے اگر آپ کا کوئی دل توڑے تو

آپ کو خود اس دل کا احساس ہو گا کہ دل کیسے بکھرتا ہے؟ کیسے ٹوٹتا ہے؟ کیسے وہ لمحہ گزرتا ہے؟ اس لیے جب کسی کی خوشی واپس لینے لگو یا کسی کا دل توڑنے لگو تو کم از کم پہلے اپنے دل کو یاد کرو کیوں کہ آپ کے سینے میں بھی دل ہے۔ آپ کے ساتھ بھی وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جو آپ دوسروں کے ساتھ کرنے جا رہے ہیں۔ انسان ہمیشہ جیسا کرتا ہے ویسا ہی بھرتا ہے۔ (حفصہ صادق، واہ کینٹ)

## اختلاف

”جو لوگ آپ سے اعلانیہ اختلاف رکھتے ہیں، ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ پریشان تو ان لوگوں کے بارے میں ہوں جو آپ سے اختلاف تو رکھتے ہیں، لیکن اظہار نہیں کرتے۔“

(حافظ محمد عمیس اقبال، خانیوال)

## معلومات عامہ

☆ دنیا میں سب سے پہلے (پہلی بس) بس 1820ء میں امریکہ میں تیار کی گئی۔

☆ 1882ء میں جدید ڈیزائن بس تیار کی گئی۔

☆ 1880ء میں برطانیہ میں بھاپ سے چلنے والی بس تیار کی گئی۔

☆ 1885ء میں پہلی مرتبہ انجن سے چلنے والی بس تیار کی گئی۔

☆ دنیا کی ابتدائی بس فرانس کے شہر پیرس میں 1662ء کو متعارف ہوئی۔ اس بس نما گاڑی کو گھوڑے کھینچتے تھے۔

☆ 1833ء میں بھاپ سے چلنے والی بس لندن میں شروع ہوئی۔

☆ دنیا کی سب سے بڑی بس چین میں ہے اس کا نام ہے Young Man JNP 6250G

☆ اس بس میں ایک وقت میں 300 مسافر سفر کرتے ہیں۔

☆ اس بس کی لمبائی 82 فٹ ہے۔

☆ اس بس کی رفتار 50 میل فی گھنٹا ہوتی ہے۔

(قاضی ایوب خان، اٹک)

## کتاب دوست

مشہور فلسفی گولڈ اسمتھ نے کہا کہ کسی کتاب کو جب میں پہلی مرتبہ پڑھتا ہوں تو مجھے ایک نیا دوست ملنے کے برابر خوشی ہوتی ہے اور جب کبھی پڑھی ہوئی کتاب دوبارہ پڑھتا ہوں تو کسی دیرینہ دوست کے ملنے کا مزہ آتا ہے۔ (میمونہ نوید، راول پنڈی)

## پلاسٹک کی بوتلوں کے نمبرز

ہماری زندگی میں پلاسٹک کی بوتلیں عام معمولات میں شامل ہیں۔ ان بوتلوں کو استعمال کے بعد پھینک دیا جاتا ہے یا پھر حد سے زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ان بوتلوں کے نیچے تکونیں بنی ہوتی ہیں جن میں کچھ نمبرز درج ہوتے ہیں وہ نمبر آپ سے کیا کہتے ہیں؟ آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں:

اگر تکون میں نمبر 1 درج ہے اس کا مطلب ہے یہ بوتل پولی تھین ٹیرینلیٹ سے بنی ہے اور پانی یا سافٹ ڈرنکس کے لیے استعمال ہوتی ہے اور اسے صرف ایک مرتبہ ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اگر تکون میں نمبر 2 درج ہے تو مطلب اسے ڈٹرجنٹ اور شیمپو جیسی اشیاء کو محفوظ کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

اگر تکون میں نمبر 3 درج ہے تو یہ بوتل پولی وینائل کلورائیڈ سے بنائی گئی ہے۔ اس بوتل کو چند ایک مخصوص اشیاء کو محفوظ کرنے کے علاوہ استعمال کرنا خطرناک ہے۔

تکون میں درج نمبر 4 والی بوتل کو دوبارہ استعمال کیا جا سکتا ہے البتہ سب سے محفوظ پلاسٹک وہ ہے جس پر بنی تکون میں نمبر 5 درج ہو۔ اس بوتل یا پلاسٹک کو آپ آئس کریم، سیرپ اور ادویات وغیرہ میں محفوظ کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

اور اگر کسی تکون میں نمبر 6 یا نمبر 7 درج ہو تو ایسی پلاسٹک کا استعمال خطرناک ہے کیوں کہ انہیں پولی اسٹائرین اور پولی کاربونیٹ سفول اے سے بنایا جاتا ہے اور ان کا استعمال انسانی صحت کے لیے مضر ہے۔ اس پلاسٹک کا استعمال کینسر اور دیگر دل کے امراض میں مبتلا کر سکتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اس پلاسٹک سے چمچ، بوتلیں اور دیگر اشیاء تیار کی جا رہی ہیں۔

(محمد ارسلان صدیقی، کراچی)

### میری بیاض سے

جس کو طوفاں سے الجھنے کی ہو عادت محسن
ایسی کشتی کو سمندر بھی دعا دیتا ہے

☆☆☆

شاید کہ چاند بھول پڑے راستہ کبھی
رکھتے ہیں اس امید پہ کچھ لوگ گھر کھلے

(محمد سمیر سلیم، کراچی)

# کام یابی کے اصول (4)
## مثبت سوچ اور عقائد کی تعمیر کیجئے

☆ جان لیجئے کہ اگر کام یابی اتنی آسان ہوتی کہ کوئی بھی اور ہر کوئی کام یاب ہو جاتا تو پھر کون اس کی خواہش کرتا؟
☆ یقین رکھیے کہ تاریک رات کے بعد اجلا سویرا ضرور ہوتا ہے۔
☆ آپ کی آنکھیں وہی کچھ دکھاتی اور کان وہی سنواتے ہیں جو آپ دیکھنا اور سننا چاہیں۔
☆ جب آپ کھڑکی سے باہر جھانکتے ہیں تو یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کوڑے کرکٹ کا ڈھیر دیکھتے ہیں یا روشن نیلا آسمان یعنی زندگی میں آپ کیا دیکھتے ہیں، یہ آپ کا انتخاب ہے۔
☆ ہر تباہی میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی بھلائی ضرور ہوتی ہے۔ مثبت طریقے سے سوچنا سیکھیے۔
☆ اپنے دماغ کے دائیں حصے کو زیادہ تسلسل سے استعمال کیجئے۔ یہ "مسائل کا حل" تلاش کرنے والا حصہ ہے، جب کہ بایاں حصہ مسائل تلاش کرتا ہے۔
☆ اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے اپنی ذات کی تعمیر کیجئے۔
☆ دماغ کی زبان سیکھئے اور بڑے اور مثبت الفاظ استعمال کیجئے۔
☆ روزانہ اپنے ساتھ ایک پرجوش گفت گو کیجئے۔
☆ جان لیجئے کہ آپ وہی کچھ مان سکتے ہیں جو آپ ماننا چاہتے ہیں۔
☆ اپنی ذات پر، اپنے مشن پر، اپنے خوابوں پر بھرپور یقین رکھیں اور اس کو یقین کو قائم رکھیں، اس سے قطع نظر کہ دوسرے اس کے متعلق کیا سوچتے ہیں۔
☆ اپنے خوابوں کی تائید کے لیے مثبت اور طاقت ور اعتقادات کی تعمیر کے لیے قائل کر دینے والی وجوہات تلاش کیجئے۔
☆ اپنے حوصلہ شکن عقائد کو حوصلہ افزاء عقائد سے بدل ڈالیں۔

**کھوج لگایئے**

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/ مارچ 2018ء ہے۔

نام: ____________________
شہر: ____________________
مکمل پتا: ____________________
____________________
موبائل نمبر: ____________________

**دماغ لڑاؤ**

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/ مارچ 2018ء ہے۔

نام: ____________________
مقام: ____________________
مکمل پتا: ____________________
موبائل نمبر: ____________________

**ہونہار مصور**

مارچ کا موضوع "ہوائی اڈہ" ارسال کرنے کی آخری تاریخ 8/ مارچ 2018ء ہے۔

نام ______________ عمر ______________
مکمل پتا: ____________________
____________________
موبائل نمبر: ____________________

**میری زندگی کے مقاصد**

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ______________ شہر ______________
مقاصد ____________________
____________________
موبائل نمبر: ____________________




ماں: ''جاوید! میں نے تمھیں کتنی بار کہا ہے کہ اچھے لڑکے لڑا نہیں کرتے۔''

جاوید: ''امی جی! صرف دو دفعہ۔''

☆

سلیم: کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ بچے انڈوں میں سے نکل آئے ہیں۔

افتخار: مگر اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ بچے انڈوں میں گھس کیسے جاتے ہیں؟

(کظیمہ زہرہ، لاہور)

ایک صاحب کی کسی دوسرے شہر میں شادی ہونے والی تھی۔ اتفاق سے وہ اسٹیشن پر سو گئے اور گاڑی چھوٹ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو بہت گھبرائے۔ سیدھے تار گھر پہنچے اور اپنی بیوی کو تار دیا۔ ''میری گاڑی چھوٹ گئی ہے۔ جب تک میں نہ آؤں، تم شادی نہ کرنا۔''

(طلعت جبیں، اوکاڑہ)

ماں۔ اشفاق، تم نے سلطان کو کیوں مارا؟

اشفاق۔ امی، آپ نے کہا تھا کہ جب کوئی چیز کھایا کرو تو اپنے بھائی کو بھی کھلایا کرو۔ آج میں نے اسکول میں مار کھائی تھی۔ تھوڑی سی سلطان کو بھی کھلا دی۔

☆

ایک صاحب ریل میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ایک دوسرے صاحب جو پاس ہی بیٹھے تھے، بولے۔ ''کیا آپ اپنی عینک تھوڑی دیر کے لیے مجھے دے سکتے ہیں؟''

پہلے صاحب نے جواب دیا۔ ''بڑی خوشی سے۔''

دوسرے صاحب نے عینک لے کر آنکھوں پر لگا لی اور بولے۔ ''چوں کہ آپ عینک کے بغیر اخبار نہیں پڑھ سکتے، اس لیے اخبار بھی مجھے دے دیجیے۔''

(صدف منیر، لاہور)

ایک صاحب کسی تیلی سے تیل لینے گئے۔ تیلی اپنے بیل کے گلے میں گھنٹی باندھ رہا تھا۔ ان صاحب نے پوچھا: ''بھئی، یہ گھنٹی کیوں باندھ رہے ہو؟''

تیلی نے کہا۔ ''اس لیے کہ اگر یہ چلتے چلتے رک جائے تو مجھے معلوم ہو جائے۔''

وہ صاحب بولے۔ ''واہ! اگر وہ کھڑا ہی کھڑا سر ہلاتا رہا تو......؟''

تیلی نے جواب دیا۔ ''بات تو ٹھیک ہے۔ مگر میرے بیل میں آپ جیسی عقل نہیں۔''

☆

بیوی۔ ''کل رات آپ پھر خواب میں بڑبڑا رہے تھے؟''

شوہر۔ ''کیا کروں۔ دن بھر تو تم بولتی رہتی ہو۔ مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔''

(صغیر اکمل، کراچی)

جیلر (قیدی سے): ''تمھیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔''

قیدی: ''جناب یہاں مجھے باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا۔''

(محمد ارسلان صدیقی، کراچی)

گاہک (دکان دار سے): ''یہ والی ٹائی کتنے کی ہے؟''

دکان دار: ''اڑھائی سو کی۔''

گاہک: ''بھائی! کچھ تو کم کریں، اڑھائی سو میں تو چپل کی جوڑی آ جاتی ہے۔''

دکان دار: ''بس پھر ٹھیک ہے، آپ چپل لے کر گلے میں لٹکا لیں۔''

(میمونہ نوید، راول پنڈی)

راحیل (نانا ابو سے): ''مجھے باجا لا دیں نا۔''

نانا ابو: ''نہیں تم باجا بجا کر سب کو تنگ کرو گے۔''

راحیل: ''میں وعدہ کرتا ہوں باجا اس وقت بجاؤں گا جب سب سو رہے ہوں گے۔''

☆

افسر نوجوان سے انٹرویو کے دوران غصے میں اس کے نظریں جھکا کر بیٹھنے پر طنز کرتے ہوئے بولا۔

افسر: ''تم نے کبھی گدھا دیکھا ہے؟''

نوجوان: نظریں جھکا کر ''نہیں سر۔''

افسر: ''تو میری طرف دیکھو نا۔'' (عفان عمار کھتران، ڈیرہ غازی خان)

☆☆☆



# بوجھو تو جانیں

1- ایک ہے ایسا کاری گر
دیکھا اس کا خوب ہنر
پتلے وہ دن رات بنائے
ایک سے ایک نہ ملنے پائے

2- سورج کے جانے پر تین
سورج کے آنے پر دو
صدیوں سے ہوتا آیا ہے
اور قیامت تک یہ ہو

3- جنت میں جانے کا حیلہ
دنیا میں وہ ایک وسیلہ
جس کو جنت کی خواہش ہو
مت بھولے اس کے قدموں کو

4- پھولوں میں دو پھول نرالے
پاتے ہیں وہ قسمت والے
کوئی تو ایک یا دونوں پائے
خالی ہاتھ کوئی رہ جائے

5- بنے ہوئے ہیں ایسے دو گھر
دیکھ سکیں نہ جن کو جا کر
ایک میں ہم کو جانا ہو گا
اور پھر وہیں ٹھکانا ہو گا

6- چھوڑو مت تم اس کا ساتھ
لے لو اس کو ہاتھوں ہاتھ
چپکے چپکے عرش پہ جائے
تحفے لے کر فرش پہ آئے

(انور کامران، لاہور)

7- پانچ پانچ ہیں دائیں بائیں
ہیں بہنیں جو گنتے جائیں

8- اک گورے کو جب نہلایا
تڑپا چیخا، شور مچایا

جوابات: 1- اللہ تعالیٰ 2- پانچ نمازیں 3- ماں 4- بیٹا، بیٹی
5- جنت، دوزخ 6- دعا 7- ہاتھ پاؤں کی انگلیاں 8- چونا

## رنگ بھریے

کیا آپ جانتے ہیں؟ یہ جن ممالک کی تصویریں ہیں ان کے دارالحکومتوں کے نام لکھیں اور رنگ بھر کر اپنی البموں میں لگائیں......
















درج ذیل دیئے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر نبیؐ کے ہم راہ کتنے صحابہ کرامؓ تھے؟

i۔ چودہ صحابہ کرامؓ ii۔ سولہ iii۔ سترہ

2۔ بتایئے ہائیڈروجن کے آمیزے کو کیا کہا جاتا ہے؟

i۔ آنسو گیس ii۔ ہیلیم گیس iii۔ واٹر گیس

3۔ مینار پاکستان کا ڈیزائن کب بنایا گیا؟

i۔1963ء ii۔1964ء iii۔1965ء

4۔ مینار پاکستان کی سلوں پر کتنی زبانیں درج ہیں؟

i۔ ایک ii۔ دو iii۔ تین

5۔ دنیا میں سب سے پہلے کس ملک کی تاریخ لکھی گئی؟

i۔ مصر ii۔ چین iii۔ یونان

6۔ مینار پاکستان پر اوپر جانے کے لیے کتنی سیڑھیاں ہیں؟

i۔324 ii۔325 iii۔326

7۔ دریائے راوی کا پرانا نام کیا ہے؟

i۔ اپراوتی ii۔ ایراوتی iii۔ اروراوتی

8۔ پاکستان نے ٹیسٹ کرکٹ کا آغاز کب کیا؟

i۔1950ء میں ii۔1951ء میں iii۔1952ء میں

9۔ علامہ اقبال کا یہ شعر بانگ درا سے لیا گیا ہے مکمل کیجیے:

انوکھی وضع ہے، سارے زمانے سے نرالے ہیں

10۔ مولانا ظفر علی خان کے والد کا نام بتایئے۔

i۔ مولوی سراج الدین ii۔ مولوی معراج الدین iii۔ مولوی باقر

## جوابات داؤدی علمی آزمائش فروری 2018ء

1- حبشہ 2-1,86000 میل 3- نیوٹن 4-Cathy
5-ابن رُشد 6- کس قدر ہم درد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ
7-انگریزی 8- پنجاب یونی ورسٹی 9- نو آنکھیں 10-1996ء

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

☆ سندس آسیہ، کراچی (150 روپے کی کتب)
☆ محمد یحییٰ، ملتان (100 روپے کی کتب)
☆ علینا اختر، کراچی (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

عروبہ امین، کراچی۔ منال فاطمہ، لاہور۔ محمد سلمان رضا قادری، کاموکی۔ عدن سجاد، جھنگ صدر۔ محمد ابوبکر عارف قادری، کاموکی۔ مطیع اللہ، جڑانوالہ۔ ملک محمد احسن، راول پنڈی۔ خدیجہ نشان، کاموکی۔ محمد عمر اشرف آرائیں، کبیر والا۔ وجیہہ شہباز، بورے والہ۔ لائبہ فاطمہ، لاہور۔ قلزا نعمان، کراچی۔ محمد اسد عبداللہ قادری، کاموکی۔ آیت اللہ ورک، لاہور۔ راج ولی خان، نوشہرہ۔ صفی الرحمٰن، لاہور۔ محمد معاذ مصطفوی، بہاول پور۔ محمد رضوان رضا قادری، کاموکی۔ محمد منیب ستار، سیال کوٹ۔ فاخر زمان، کرک۔ حسن رضا سردار وصفی، کاموکی۔ نعمان اکرم، اوکاڑہ۔ ہارون یوسف، لاہور۔ محمد سالار، گوجر خان۔ ولید اشرف، لاہور۔ درشہوار، کراچی۔ معظم علی، ڈیرہ غازی خان۔ ناصر حسین، گوجرانوالہ۔ تبسم شیریں، کوئٹہ۔ صالحہ کاردار، لاہور۔ طلحہ زبیر، گجرات۔ تنویر علی، فیصل آباد۔ محمود سلطانہ، راول پنڈی۔ بشریٰ تسنیم، منڈی بہاؤ الدین۔ دردانہ فہیم، شیخوپورہ۔ فاطمہ علی، رحیم یار خان، ثانیہ سعید، صادق آباد۔ ظل ہما، بہاول پور۔ صوفیہ نسرین، اسلام آباد۔ محمد احمد، لاہور۔ کظیمہ زہرہ، جھنگ۔ احور کامران، لاہور۔ عامرہ حسین، بورے والا۔ قضہ کریم، ساہی وال۔ درنایاب، گوجرانوالہ۔ ساجدہ افضل، عارف والا۔ ربیعہ خلیل، لاہور۔ افضل حسین، گجرات۔ عمران علی، کراچی۔ وجاہت علی، پشاور۔ طارق کمال، ہارون آباد۔ انیس طیب، بہاول نگر۔ اصغر علی، چشتیاں۔ خاور علی، ساہی وال۔ پروین خان، ڈیرہ غازی خان۔ عائشہ اکبر، فیصل آباد۔ اصغر بٹ، سیال کوٹ۔ آصفہ رشید، شیخوپورہ۔ ناصرہ رشید، گوجرانوالہ۔ امین یاسر، لاہور۔ انس ناصر، کاموکی۔ سجاد اکبر۔ سیال کوٹ۔ عرشیہ سلیم، گوجرانوالہ۔ منتہاء امین، اسلام آباد۔ عاطفہ اکرم، گجرات۔ نادرہ یوسف، لاہور۔ عبداللہ یامین، ڈیرہ غازی خان۔






# تحریک پاکستان کی یادگار مینار پاکستان

رانا محمد شاہد

اسلام اور استحکام پاکستان کی علامت مینار پاکستان ہمارا قومی و ثقافتی ورثہ ہے۔ مینار پاکستان اسی جگہ تعمیر کیا گیا۔ جہاں 23 مارچ 1940ء کو قائداعظم محمد علی جناح کی زیرصدارت آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ یہ تحریک پاکستان کی عظیم یادگار ہے۔ اپنی تاریخی حیثیت کی وجہ سے لوگوں کے لیے یہ بہت دل چسپی رکھتا ہے۔ یہ تاریخی اجلاس منٹو پارک میں منعقد ہوا تھا۔ جسے قیام پاکستان کے بعد اقبال پارک کا نام دے دیا گیا۔ پاکستان میں سب سے زیادہ تاریخی اہمیت اسی اقبال پارک کو حاصل ہے۔ 23 مارچ 1940ء وہ تاریخی موقع تھا جب الگ وطن کے حصول کے مطالبے کو ایک منزل ملی۔

اس تاریخی جگہ کی اہمیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے برقرار رکھنے کے لیے یہاں ایک یادگار تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ 23 مارچ 1960ء کو اس مینار کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس وقت کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ اس کمیٹی کی منظور کردہ سفارشات اور ڈیزائن کی روشنی میں مینار کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ اس عظیم یادگار کا ڈیزائن یا خاکہ ترک ماہر تعمیرات نصیر الدین مرات خان نے تیار کیا۔ نصیر الدین مرات روسی نژاد مسلمان تھے۔

مرات خان 1904ء میں کوہ قاف میں واقع سلطنت روس کے شہر داغستان میں پیدا ہوئے۔ 1930ء میں انہوں نے لینن گراڈ یونیورسٹی سے مدنی ہند سیاست کی ڈگری حاصل کی۔ اسی یونیورسٹی سے انہوں نے معماری یعنی آرکیٹکٹ اور عمرانیات کی ڈگری بھی حاصل کی۔ نصیر الدین مرات خان نے روس میں بھی کئی اعلیٰ عہدوں پر کام کیا۔ مرات خان عظیم مجاہد امام شامل کے پیروکار تھے۔ امام شامل وہ مجاہد تھے۔ جنہوں نے روسی تسلط کے خلاف کئی سال تک جدوجہد کی۔ سٹالن حکومت کے ناروا رویے اور پھر گرفتاری کے بعد جب مرات خان رہا ہوئے تو وہ جرمنی چلے گئے۔ جہاں انہوں نے ایک پاکستانی نژاد خاتون حمیدہ بیگم سے شادی کر لی۔ پھر انہوں نے پاکستان کو اپنا مسکن بنا لیا۔ 1950ء میں وہ اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آ گئے۔

نصیر الدین مرات خان نے مینار پاکستان کے علاوہ آرکیٹکٹ اور سول انجینئر کی حیثیت سے کئی اور عمارتیں بھی ڈیزائن کیں۔ ان میں قذافی اسٹیڈیم اور سروسز اسپتال زیادہ اہم ہیں۔ انہیں ان کی خدمات کے اعتراف میں تمغۂ امتیاز سے نوازا گیا۔ مرات خان اپنی ٹیم کے ساتھ تقریباً 8 برس تک مینار پاکستان کی ڈیزائننگ اور تعمیر

میں مصروف رہے۔ پاکستان کی محبت میں انہوں نے اپنے کام کا کوئی معاوضہ نہ لیا۔ کیوں کہ پاکستان نے انہیں اپنا گھر دیا تھا۔ کمشنر لاہور سے اختلافات کی وجہ سے مینار پاکستان کی تکمیل سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ پھر مینار پاکستان کی افتتاحی تقریب میں بھی انہیں مدعو نہیں کیا گیا۔ عوامی سطح پر بھی ان کے کام کو پذیرائی نہیں مل سکی۔ چناں چہ انہی مایوسیوں میں گھرے 1970ء میں دل کے دورے کے باعث وہ انتقال کر گئے۔

مینار پاکستان ہائپر بولا ڈیزائن میں تعمیر کیا گیا۔ اس ڈیزائن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عمارت کی چوڑائی بتدریج کم ہوتی جاتی ہے۔ مینار پاکستان کی تعمیر میں میاں عبدالخالق اینڈ کمپنی کا بھی اہم کردار ہے۔ اس کمپنی نے 23 مارچ 1960ء کو مینار پاکستان کی تعمیر کا آغاز کیا اور 21 اکتوبر 1968ء کو اس کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ مینار پاکستان کی تعمیر پر کل 75 لاکھ روپے لاگت آئی۔ مینار پاکستان کی تعمیر کے لیے اتنی خطیر رقم کہاں سے آئی۔ کہا جاتا ہے کہ حکومت نے سینما گھروں کی ٹکٹس پر ٹیکس لگا کر پیسے اکٹھے کیے۔

196 فٹ 6 انچ تک بلند مینار پاکستان کو 180 فٹ تک لوہے اور کنکریٹ سے تعمیر کیا گیا ہے۔ جب کہ باقی ساڑھے سولہ فٹ میں اسٹین لیس اسٹیل کا ایک گنبد بنایا گیا ہے۔ جس سے سورج کی روشنی منعکس ہو کر ماحول کو روشن کرتی ہے۔ مینار پاکستان کے آس پاس پل اور تعمیرات کی وجہ سے اب مینار پاکستان کی کل جگہ 18 ایکڑ سے بھی کم ہے۔ مینار کے اوپر جانے کے لیے 324 سیڑھیاں ہیں۔ اوپر کا حصہ مخدوش ہونے کی وجہ سے وہاں جانا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ کافی عرصہ پہلے مینار پاکستان کی سیاحت کا موقع ملا تھا۔ اس وقت بھی سب سے اوپر والے حصے میں جانا چاہا تو انتظامیہ کے ایک فرد نے کہا کہ اوپر جانا مکمل طور پر بند ہے۔ اسی طرح اوپر سے نیچے والے حصے کی حالت بھی خاصی مخدوش تھی۔ ایک طرف سے مینار کا کچھ حصہ ٹوٹا ہوا تھا۔ آج کل تو سیکیورٹی کی وجہ سے بھی حالات مختلف ہیں۔ ایک جدید لفٹ بھی نصب کی گئی ہے۔ مینار کا نچلا حصہ پھول کی پتیوں کے مشابہ ہے۔

مینار پاکستان کی سنگ مرمر سے بنی دیواروں پر 19 تختیاں نصب ہیں۔ جن پر قرآن مجید کی آیات، اللہ تعالیٰ کے 99 اسمائے حسنیٰ، قائداعظم کی تقریروں کے اقتباسات، علامہ اقبال کے اشعار، قومی ترانہ اور پاکستان کی آزادی کی مختصر تاریخ اردو اور بنگالی میں کندہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مینار پاکستان کی دیواروں پر قرار داد پاکستان کا مکمل متن بھی کندہ کیا گیا ہے۔ مینار پاکستان کی دیواروں پر خطاطی کرنے والوں میں حافظ محمد یوسف سدیدی، صوفی خورشید عالم، محمد صدیق الماس رقم، ابن پروین رقم اور محمد اقبال شامل ہیں۔ مینار پاکستان کے احاطے میں ہی پاکستان کے قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری آسودۂ خاک ہیں۔

ابتدائی طور پر اس مینار کو "یادگار پاکستان" کہا جاتا تھا۔ جب ڈھانچے کی شکل دے کر اسے بانسوں کے پیچھے چھپایا گیا تو یہ یادگار پاکستان ہی تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اسے مینار پاکستان کہا جانے لگا۔ اگر آپ لاہور کی سیاحت کے لیے جائیں تو اکثر لوگ اب بھی اسے یادگار پاکستان ہی کہتے ہیں۔ خصوصاً بس یا وین کے سفر میں اگر آپ کی منزل مینار پاکستان ہو تو کنڈیکٹر اسے "یادگار" ہی کہتے ہیں۔

جون 1984ء کو ایل ای ڈی نے اس مینار کو اپنی تحویل میں لے لیا اور آہستہ آہستہ اسے ایک پبلک پارک کی شکل دے دی۔ مینار پاکستان کے اردگرد خوب صورت سبزہ زار، فوارے، راہ داریاں اور ایک جھیل بھی ہے۔ آج پاکستان بھر سے لوگ اس عظیم یادگار کی سیاحت کے لیے آتے اور حصول پاکستان کے لیے کی گئی کوششوں پر اپنے اسلاف کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

یادگار پاکستان امریکہ کے مجسمۂ آزادی اور فرانس کے ایفل ٹاور سے زیادہ خوب صورت اور دل کش ہے۔ یہ مغلیہ اور جدید فن تعمیر کا ایک شاہکار ہے۔ اس مینار کی بنیاد 5 کونوں کا ستارہ ہے۔ جو پاکستانیوں کے درخشاں مستقبل کا نشان ہے۔ قومی تہواروں خصوصاً یوم پاکستان اور یوم آزدی پر مینار پاکستان پر بہت رش ہوتا ہے۔ ان تہواروں پہ تعلیمی اداروں میں بھی خصوصی تقریبات کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ جہاں قائداعظم اور علامہ اقبال کے ساتھ ساتھ تحریک پاکستان کے دیگر رہنماؤں و مشاہیر کے کاموں و کارناموں کو یاد کیا جاتا ہے۔ ☆☆☆





# کوا ...... پرندوں میں سب سے ذہین

محمد خلیل چودھری

حیوانات

حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے۔ ہابیل اور قابیل۔ ایک دن کسی بات پر دونوں کے درمیان جھگڑا ہوگیا۔ غصے میں آ کر قابیل نے اپنے بھائی کو مار ڈالا۔ اس کے بعد قابیل کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ہابیل کی لاش کہاں چھپائے؟ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ مردہ دفن کیا جاتا ہے۔ پھر وہ بھائی کو مار کر شرمندہ بھی تھا۔ اس کی پریشانی دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے ایک کوا قابیل کی طرف بھجوایا۔ کوا اپنے پنجوں سے زمین کرید کر اسے دکھانے لگا کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کیسے دفن کرے...... یوں اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوے نے انسان کو یہ بات سکھائی کہ مردہ زمین میں دفن کیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ قرآن پاک کی سورت مائدہ آیت نمبر 27 تا 31 میں بیان کیا گیا ہے۔ اس واقعے میں کوے نے نہ صرف اللہ تعالیٰ کے پیغام بر کا کردار ادا کیا بلکہ لاش دفن کرنے کے سلسلے میں انسان کا استاد بن گیا۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ کوا ایک ذہین پرندہ ہے۔ تبھی تو اللہ تعالیٰ نے اسے قابیل کے پاس بھجوایا۔

☆ کوے کے جسم میں پر، چونچ، ٹانگیں، پیر اور پنجے سیاہ ہوتے ہیں۔ بس سینہ سفیدی مائل ہوتا ہے۔ وزن تقریباً ایک کلو اور لمبائی 15 سے 21 انچ ہوتی ہے۔ اڑنے کی عام رفتار 30 میل فی گھنٹہ ہے۔ تاہم وہ کچھ مدت کے لیے 60 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑتا ہے۔ نظر تیز ہے اور سننے کی صلاحیت شان دار، اسی لیے تمام اقسام کے کوے بہت چست و چالاک ہوتے ہیں۔ کبھی نچلے نہیں بیٹھتے۔ جنگلی کوا عام طور پر چھ سات جب کہ پالتو کوا بیس سال تک زندہ رہتا ہے۔

☆ کوا اونچے درخت یا بلند عمارت کے چھجے پر ٹہنیوں، تنکوں، دھاگوں اور شاخوں وغیرہ سے پیالے کی شکل کا گھونسلا بناتا ہے۔ مادہ پھر اس میں چار پانچ انڈے دیتی ہے۔ بیس دن بعد انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں۔

☆ کوے بڑی محبت اور توجہ سے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ وہ سارا دن ادھر ادھر اڑ کر ان کے لیے خوراک ڈھونڈتے اور انہیں کھلاتے ہیں۔ جب مادہ دانہ لینے جائے تو کوا بچوں کی حفاظت کرتا ہے۔ پھر مادہ کی باری آتی ہے۔ کوا اپنے بچوں کی خاطر چیل، عقاب، حتیٰ کہ انسان سے بھی ٹکر لے سکتا ہے۔

☆ کوے کو کوئی خاص کھانا پسند نہیں وہ کچھ بھی کھا لیتا ہے مثلاً مچھلیاں، سانپ، پھل، بیج، اناج اور سبزیاں۔ موقع ملے تو دوسرے پرندوں کے انڈے حتیٰ کہ بچے بھی کھا جاتا ہے۔ گھر کے کوڑے میں سے بھی کھانا چوری کر لیتا ہے۔ کوا خوراک کی تلاش میں 50 میل تک سفر کر سکتا ہے۔ بھوک ہو تو مردہ جانور بھی کھا جاتا ہے۔

☆ آپ جانتے ہوں گے طوفان آنے سے قبل حضرت نوحؑ نے تمام پرندوں کے جوڑے اپنی کشتی میں لیے تھے۔ جب

طوفان تھم گیا تو حضرت نوحؑ نے ایک فاختہ بھیجی جو واپس آ گئی۔ پھر آپ نے ایک کوا بھیجا۔ جو پلٹ کر نہ آیا۔ یوں آپ سمجھ گئے کہ اسے زمین مل گئی ہے۔ یہ واقعہ بھی کوے کی ذہانت کو نمایاں کرتا ہے۔

☆ برطانیہ میں ایک مینار ٹاور آف لندن کہلاتا ہے وہاں کئی سو برس سے چار تا چھ کوے پالے جا رہے ہیں۔ دراصل برطانیہ میں یہ روایت مشہور ہے کہ جب ٹاور پر کوے نہ رہے تو برطانوی بادشاہت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ 1675ء میں ٹاور پر ایک رصدگاہ بنائی گئی۔ جلد ہی ماہرین فلکیات نے بادشاہ چارلیس دوم سے شکایت کی کہ ٹاور کے کوے انہیں بہت تنگ کرتے ہیں۔ بادشاہ نے کوے مارنے کا حکم دیا۔ لیکن ٹاور کے چوکی داروں نے اسے روایت کے بارے میں بتایا تو وہ ڈر گیا۔ یوں کوے تو ٹاور ہی میں رہے البتہ رصدگاہ گرین وچ کے مقام پر منتقل ہو گئی۔

☆ عقاب، شاہین، چیلیں اور الو کوے کے دشمن ہیں۔ لیکن اس کا سب سے بڑا دشمن انسان ہے۔ دراصل کہیں کوؤں کی تعداد بڑھ جائے تو وہ بہت شور مچاتے اور گھروں میں کوڑا بکھیرتے ہیں۔ اسی لیے دنیا میں کئی جگہ بندوقوں سے ان کا شکار ہوتا ہے۔

☆ ماہرین کے مطابق تمام پرندوں میں کوا سب سے ذہین ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کا دماغ بڑا ہے لہٰذا وہ کوئی بھی مسئلہ جلد حل کر لیتا ہے۔ کوئی انسان بندوق لیے ہوئے ہو تو وہ جان جاتا ہے کہ یہ شکاری ہے۔ یوں وہ اڑ جاتا ہے لیکن کوئی آدمی کھیتی باڑی کا سامان لیے ہوئے ہو تو کوا نہیں اڑتا وہ جانتا ہے کہ یہ کسان ہے۔ کوؤں کی بعض اقسام شاخوں اور تاروں سے بہ طور آلہ کار کام لیتی ہیں۔ ذہانت کے معاملے میں صرف بندر اور ڈولفن کوے سے آگے ہیں۔

☆ کوا بھی تمام پرندوں کی طرح خوبیاں اور خامیاں رکھتا ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ فصلوں اور پھلوں کے باغات کو نقصان پہنچانے والے کیڑے اور سنڈیاں کھاتا ہے۔ نیز کوڑا کھا کر ماحول صاف رکھتا ہے۔ کوا مصیبت اس وقت بنتا ہے جب وہ مکئی یا گندم کی فصل یا باغ میں پھل کھانے لگے تب کسان اور باغ کے رکھوالے اسے مار بھگاتے ہیں۔

☆ کوا اس لحاظ سے عجیب پرندہ ہے کہ کہیں اسے خوش قسمتی کا نشان سمجھا جاتا ہے اور کہیں نحوست کا! دنیا کی بعض اقوام اسے دیوتا سمجھتی ہیں اور کچھ شیطان۔ مثلاً جزائر الکاہل کے قبائلی سمجھتے ہیں کہ کائنات کوے کی تخلیق ہے جب کہ سویڈن اور جرمنی میں کوے کو بدروح یا برے انسانوں کی روحیں سمجھا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔کوے سے کئی توہمات بھی وابستہ ہیں مثلاً ہمارے ہاں گھر کی دیوار پر کوا خوب شور مچائے تو کہتے ہیں کہ آج مہمان آئیں گے۔ کوے سے متعلق کئی محاورے اور ضرب المثل بھی موجود ہیں۔

☆ کوؤں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ مل جل کر رہتے ہیں اور تکلیف میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی بلی یا بچہ کسی کوے کو تنگ کرے تو وہ کائیں کائیں کر کے بہت سے کوے اکٹھے کر لیتا ہے یہ کوے پھر دشمن پر حملہ بھی کر سکتے ہیں۔ شام کے وقت کئی کوے ایک درخت پر بیٹھ کر جلسہ منعقد کرتے ہیں۔ یہ ان کے اتحاد اور طاقت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

☆ برصغیر پاک و ہند میں ملنے والا کوا گھریلو کوا (House Crow) کہلاتا ہے۔ چڑیوں کی چوں چوں کے ساتھ اس کی کائیں کائیں بھی صبح سویرے ہمارا استقبال کرتی ہے۔ یہ بھی بڑا ذہین اور چالاک ہے صحن میں کھانے کی کوئی شے رکھی ہو تو موقع پاتے ہی لے اڑتا ہے۔

☆ بھوٹان جنوبی ایشیا کا ایک ملک ہے۔ کوا بھوٹان کا قومی پرندہ ہے۔ بلکہ وہاں اسے دیوتا کی حیثیت حاصل ہے اور بھوٹان کے لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اسی لیے شاہ بھوٹان کے تاج پر بھی ننھا سا کوا بنا ہوا ہے۔

☆ 1515ء میں برطانیہ کے بادشاہ ہنری ہشتم نے حکم دیا کہ جو جتنے زیادہ کوے مارے گا۔ اسے اتنا ہی زیادہ انعام ملے گا۔ دراصل اس زمانے میں کوے کو خون خوار پرندہ سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے یہ شاہی حکم جاری کیا گیا۔

☆ جنوب مشرقی انگلینڈ کے علاقے کینٹ کی ایک دل چسپ خبر سامنے آئی جب کوؤں نے زمین میں دبائے گئے کوڑے کرکٹ کے تھیلے زمین کھود کر نکالنا شروع کر دیے۔ کوؤں کی اس حرکت سے کوڑا کرکٹ تو زمین پر بکھر گیا لیکن پولیس کو کچھ خفیہ قسم کے کاغذات ملے جن میں بنک سے متعلق اہم معلومات بھی تھیں۔ یہ کاغذات کوڑے کرکٹ کے ساتھ زمین میں دبا دیے گئے تھے لیکن کوؤں نے راز فاش کر دیا۔

☆☆☆




رانا محمد شاہد

# قصہ خوانی بازار

پھولوں کے شہر پشاور کے قلب میں مشہور قصہ خوانی بازار واقع ہے۔ ایک قدیم بازار ہونے کی وجہ سے اسے ''پاکستان کا بغداد'' بھی کہا جاتا ہے۔ الف لیلیٰ کے قصوں کی وجہ سے جو شہرت عراق کے شہر بغداد کو ملی، وہ ہمیشہ قائم رہے گی۔ چناں چہ اسی مناسبت سے اسے ''پاکستان کا بغداد'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں موجود قہوے کی دکانوں اور معاوضہ کے عوض قصے سنانے والے قدیم قصہ گوؤں نے پشاور کے اس علاقے کو ہمیشہ کے لیے تاریخ کا حصہ بنا دیا۔

ماضی میں پشاور شہر کے گرد ایک طویل دیوار ہوتی تھی۔ جس کے سولہ 16 داخلی دروازے تھے۔ انھی میں سے ایک کابلی دروازہ (کابلی گیٹ) بھی تھا۔ یہیں سے قصہ خوانی بازار شروع ہوتا تھا۔ وقت نے وہ دیوار اور دروازے ختم کر دیے۔ مگر ان کا نام اب بھی باقی ہے۔ 19 ویں صدی میں پشاور میں تعینات برطانوی ہائی کمشنر ہاربرڈ ایڈورڈ نے اس بازار کو وسطی ایشیا کا سرکس قرار دیا تھا۔ جب کہ قصہ خوانی بازار کی محبت میں ایک یورپی شاعر روڈ یارڈ کپلنگ ایسا گرفتار ہوا کہ اس بازار پر بہت سی نظمیں لکھ ڈالیں۔

پشاور اور سبز چائے یا قہوہ تو لازم و ملزوم ہیں۔ یہ یہاں کے لوگوں کی زندگیوں کا ایک اہم حصہ ہے اور یہ اپنے مہمانوں کی تواضع قہوے اور خشک میوہ جات سے ہی کرتے ہیں۔ البتہ قصہ خوانی بازار کے قہوے کی شہرت پوری دنیا میں پھیلی ہے۔ یہ خاص قسم کا قہوہ خاص قسم کی پتیوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ قصہ خوانی بازار میں بے شمار چھوٹے بڑے قہوہ خانے موجود ہیں۔ اس بازار کی سیر کے لیے آنے والے لوگ کچھ اور خریدیں یا نہ خریدیں البتہ قہوے سے ضرور لطف اٹھاتے ہیں اور بہت سے سیاح تو صرف قہوے کی وجہ سے ہی قصہ خوانی بازار کا رخ کرتے ہیں۔

ماضی میں قصہ خوانی بازار اپنے روایتی کھانوں اور مصنوعات کی وجہ سے بہت شہرت رکھتا تھا۔ اس لیے یہ سیاحوں کی دل چسپی کی وجہ تھی۔ یہاں مٹھائیوں، فالودہ اور کانسی کے برتنوں کا وسیع کاروبار تھا۔ البتہ یہاں کے روایتی قہوہ خانوں، تکہ کباب، چپلی کباب اور خشک میوہ جات خاص سوغاتیں تھیں۔ پہلے وقتوں میں ان اشیاء کی تجارت سے منسلک مختلف دور دراز کے علاقوں سے آئے تاجر یہاں کے مہمان خانوں میں قیام کرتے اور اپنے اپنے ملک کے حالات قصہ کہانی کی صورت بیان کرتے۔ تجارتی قافلے آگے جانے کے لیے یہاں کئی کئی دن قیام کرتے۔ ان تاجروں کے علاوہ قافلوں کا بھی قیام ہوتا۔ فوجی مہمات کا آغاز اور پھر اختتام جو عموماً ہر مہم کے احوال کے ساتھ ہوتا۔ یہاں کے قصہ گو علاقے بھر میں مشہور تھے۔

ایک روایت یہ بھی چل نکلی کہ پیشہ ور قصہ گو قہوے کی دکانوں پر مستقل موجود ہوتے اور قہوہ پینے کے شوقین مسافروں کو ان کی پسند کے مطابق قصے کہانیاں سناتے۔ اکثر مختلف مسافروں، تاجروں اور فوجیوں کے سنائے قصوں کو نہایت عمدہ اور دل چسپ انداز میں بیان کیا جاتا۔ یہ طریقہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے آج کل ہوٹلوں اور چائے خانوں میں ٹیلی ویژن رکھے نظر آتے ہیں۔ جن پہ چلنے والے پروگرام کھانے پینے والے افراد کو محظوظ کرتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں چوں کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا کوئی تصور نہ تھا۔ چناں چہ

یہ کام قصہ گو ادا کرتے تھے کہ وہ آنے والوں کے لیے قصے کہانیوں کی شکل میں ایسا ہی دل چسپی کا سامان کرتے جو آج کل ٹیلی ویژن کرتا ہے۔ یوں قصہ خوانی بازار کی قائم ہونے والی یہ روایت آج بھی اس کی پہچان ہے۔

قدیم و تاریخی قصہ خوانی بازار کی عمارات کا طرز تعمیر نہایت دل کش ہے۔ یہاں بے شمار قدیم عمارتیں اور سرائے ہیں۔ ان عمارتوں میں خاص قسم کی لکڑی کا استعمال ہوا ہے۔ سرائے (گیسٹ ہاؤسز) یہاں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ آنے والے مسافروں، سیاحوں کو مناسب قیمت پر آرام دہ ماحول مہیا کرتے ہیں۔ اگرچہ جدید ہوٹلز اور بڑے بڑے گیسٹ ہاؤسز کی وجہ سے بہت ترقی ہوگئی ہے۔ مگر ان سرائے خانوں کی خاص انفرادیت اور یہاں کے ماحول میں رچی بسی ثقافت کی خوش بو ان جدید گیسٹ ہاؤسز و ہوٹلز سے کبھی نہیں آسکتی۔ یہاں کے چترالی بازار کی چترالی ٹوپیاں اور اونی کپڑے دنیا بھر میں اس کی پہچان ہیں۔

آرائشی اشیاء اور پھولوں و پھلوں کی بہت سی دکانیں بھی اس بازار میں جابجا نظر آتی ہیں۔ اس بازار میں علم و کتاب سے محبت کرنے والوں کا سامان بھی موجود ہے۔ یہاں کچھ پبلشنگ کے ادارے بھی موجود ہیں۔ جہاں سے اردو، پشتو اور فارسی زبانوں میں کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اس بازار کی ایک اور وجۂ شہرت پیتل کے برتن، باورچی خانے کے آلات و دیگر آرائشی سامان بھی ہے۔ یہ اپنے منفرد اسٹائل کی وجہ سے پاکستان بھر میں مشہور ہیں۔ اسی لیے لوگ نہ صرف اپنے استعمال کے لیے بلکہ اپنے رشتے داروں و دوستوں کو تحفے تحائف دینے کے لیے بھی یہیں سے مصنوعات خریدتے ہیں۔ یورپ اور خلیجی ریاستوں میں بھی یہاں کی مصنوعات بہت مقبول ہیں لیکن اب کچھ عرصے سے امن و امان کی مخدوش صورت حال کی وجہ سے یہ کاروبار تقریباً ٹھپ ہو چکا ہے۔ ساٹھ اور ستر کی دہائی میں ہزاروں ملکی و غیر ملکی افراد یہاں کا رخ کرتے تھے اور کاروبار بھی اپنے عروج پر ہوتا تھا۔ یہاں کاری گروں اور دست کاروں کی تعداد پانچ سو کے قریب تھی۔ مگر وقت اور حالات نے انہیں دوسرے کاموں کی طرف راغب کر دیا۔ یوں اس بازار کی رونق ماند پڑتی چلی گئی۔ کسی دور میں پشاور میں ہینڈی کرافٹ (دست کاری) کا کاروبار بہت فروغ پا رہا تھا۔ جو اب قصۂ پارینہ ہوتا جا رہا ہے۔

اگرچہ آج اس بازار میں قصہ گو نظر نہیں آتے۔ تاہم قصے کہانیوں پہ مبنی کتابوں کی دکانیں موجود ہیں۔ اگر آپ کو پشاور بھر سے اس موضوع پر کتاب نہ ملے تو قصہ خوانی بازار کا چکر ضرور لگایئے۔ کیوں کہ اس بازار میں موجود پرانی کتابوں کی دکان سے آپ کو مطلوبہ کتاب ضرور مل جائے گی۔

قصہ خوانی بازار میں کبھی سیاست و دیگر موضوعات پر بحث و مباحثہ اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ادبی، ثقافتی اور سیاسی تقاریر کے لیے یہ بازار بہت شہرت رکھتا تھا۔ کئی معروف سیاسی رہنماؤں کی تقریروں نے اس علاقے کی سیاسی تاریخ کو بہت اہمیت دی ہے۔ کئی سیاسی رہنما و مذہبی اسکالرز عوامی اجتماعات سے خطاب کر چکے ہیں۔ ان میں خان عبدالغفار خان، علامہ عنایت اللہ مشرقی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ذوالفقار علی بھٹو، خان عبدالولی خان، اجمل خٹک، امیر حمزہ خان شنواری اور احمد ندیم قاسمی و دیگر شامل ہیں۔

قصہ خوانی بازار کی ایک اور اہم تاریخی عمارت مسجد قاسم علی خان ہے۔ اس تاریخی مسجد میں ہر سال عید الفطر کے موقع پر غیر سرکاری رویت ہلال کمیٹی کا اجلاس ہوتا ہے۔ یہ غیر سرکاری رویت ہلال کمیٹی اپنے طور پر رمضان المبارک اور عیدین کی شہادتیں جمع کرتی اور پھر ان کی روشنی میں رویت کا اعلان کرتی ہے۔

قصہ خوانی بازار پر پاکستان کے مشہور شاعر و ادیب قتیل شفائی نے 1970ء میں ایک فلم بھی بنائی تھی۔ اسی بازار سے متصل محلہ خداداد میں پیدا ہوئے۔ ہندی سینما کے 100 سال مکمل ہونے پر محمد ضیاء نے 600 صفحات پر مشتمل ایک کتاب "پشاور کے فخر" لکھی۔ اس میں 150 سے زیادہ اداکاروں کا ذکر کیا گیا۔ آغا پیر جان کو یہاں کی فلموں کے اولین اداکار کہا جاتا ہے۔

وہ قصہ خوانی بازار جو کبھی امن کا گہوارہ اور قصہ گوؤں کا مرکز ہوتا تھا۔ جو کاروباری لحاظ سے بھی ایک اہم مقام اور غیر ملکی سیاحوں کے لیے کشش کا باعث تھا۔ آج زوال پذیر ہے۔ پرانی چیزوں اور مقامات سے محبت کرنے والے قصہ خوانی بازار کی ایسی حالت دیکھ کر بہت دل گرفتہ اور مایوس ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہاں کی تاریخی عمارات و مقامات کی تزئین و آرائش کی جائے اور امن و امان کی صورت حال کو بہتر بنایا جائے تاکہ قصہ خوانی بازار کی رونقیں پھر سے بحال ہوں۔ حکومت کے ساتھ ساتھ ہماری بھی ذمہ داری ہے کہ اپنے تاریخی ورثے کی حفاظت کریں۔

☆☆☆






**منال فاطمہ، لاہور**

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔



**محمد شبیہ الدین،**

میں بڑا ہو کر پائلٹ بننا چاہتا ہوں۔ ملک کا نام روشن کروں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔



**عبدالسمیع خان، لاہور**

میں بڑا ہو کر پاک فضائیہ میں جانا چاہتا ہوں۔



**حبیب الرحمٰن، سرگودھا**

ان شاء اللہ کے ای میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس ڈاکٹر بن کر دکھی مریضوں کا مفت علاج کروں گا۔



**اقصیٰ، رانی حبیب، اسلام آباد**

ہم دونوں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کریں گی۔



**عائزہ وحید، آزاد کشمیر**

میں فائٹر پائلٹ بن کر اپنے ملک کی حفاظت کروں گی۔



**حبیبہ فاطمہ، فیصل آباد**

میرا مقصد اپنی زندگی کو شمع کی طرح جلانا ہے۔



**شہریار جمیل، لاہور**

میں ڈاکٹر بن کر لوگوں کا علاج کروں گا۔



**زین بلوچ، لاہور**

میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا۔



**محمد شمعون بٹ، لاہور**

میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا اور ملک میں ترقی کی شمع جلاؤں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔



**ایمن نذیر، لاہور**

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی۔



**سعید عباس، اٹھارہ ہزاری**

چاند پر جانے والا پہلا پاکستانی بن کر وطن کا نام روشن کروں گا۔



**عبداللہ عزیز، لاہور**

فوج میں شامل ہو کر ملک و قوم کی حفاظت کروں گا۔



**سعدیہ صفدر، لاہور**

میں ڈاکٹر بن کر لوگوں کا مفت علاج کروں گی۔



**محمد ہارون عرفان، راولپنڈی**

میں بڑا ہو کر اسلام کا مجاہد بنوں گا اور اسلام دشمن کو نیست و نابود کروں گا۔



**عاقب کبریا، سرائے عالمگیر**

میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور اپنے ملک پاکستان کی خدمت و حفاظت کروں گا۔



**بشریٰ نور، لاہور**

میں ان شاء اللہ بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی۔



**محمد شاس حسین، بہاولپور**

میں عالم دین بنوں گا اور دین کی روشنی پھیلاؤں گا۔



**محسن کبریا، سرائے عالمگیر**

میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور اپنے ملک کی حفاظت کروں گا۔



**نور فاطمہ شاہد، لاہور**

میں ٹیچر بن کر بچوں کا مستقبل روشن کروں گی۔



**فراز احمد، وزیرآباد**

میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں گا پھر فوجی بن کر ملک و قوم کی حفاظت کروں گا۔



**وردہ ریاض، لاہور**

میں بڑی ہو کر ٹیچر بنوں گی اور جہالت کے اندھیرے ختم کروں گی۔



**محمد عمر، چکوال**

میرا مقصد سی ایس پی افسر بن کر ملک کی خدمت کرنا ہے۔



**مصباح مبشر، جھنگ**

میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔



**محمد ربیع خرم، راولپنڈی**

علم کی روشنی پھیلانا۔







# مولانا ظفر علی خان

غلام حسین میمن

آل انڈیا مسلم لیگ کا 27 واں سالانہ اجلاس لاہور کے منٹو پارک میں کرانے کا فیصلہ ہوا۔ اس جلسے کے لیے جوش و خروش سے تیاریاں جاری تھیں، مگر حکومت اس جلسے کی اجازت دینے میں ہچکچا رہی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ چند دن قبل ہی خاکسار تحریک کی جانب سے بدنظمی ہو چکی تھی اور مزید کسی بدنظمی سے بچنے کے لیے حکومت کی خواہش تھی کہ یہ جلسہ نہ ہو۔ بالآخر کافی یقین دہانی کے بعد مسلم لیگ کا یہ جلسہ 22 تا 24 مارچ 1940ء کو لاہور میں منعقد ہوا۔ قائداعظم محمد علی جناح 22 مارچ کو جب جلسہ گاہ آنے لگے تو سب سے پہلے انہوں نے اسپتال جا کر خاکسار تحریک کے ان زخمی کارکنان کی عیادت کی جو وہاں زیرِعلاج تھے۔ اس کے بعد قائداعظم جلسہ گاہ آئے۔

دوسرے دن 23 مارچ 1940ء کو اس عظیم الشان جلسے میں قرار داد لاہور پیش ہوئی۔ اس میں مسلمانوں کے حقوق کا مطالبہ بڑی شدت سے کیا گیا۔ اگلے روز سے ہی ہندو اخبارات نے اس شدت سے واویلا مچایا کہ قرارداد، قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہو گئی۔ یہ قرار داد 23 مارچ 1940ء کو شیر بنگال مولوی اے کے فضل الحق نے انگریزی میں پیش کی۔ قرار داد پیش کرنے کے فوراً بعد اس کا فی البدیہہ اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا۔ مولانا ظفر علی خان اس قرار داد کی تائید کرنے والوں میں بھی پیش پیش تھے۔ یہ قرار داد اس عظیم الشان جلسے کے شرکاء نے اگلے روز 24 مارچ کو منظور کی۔

مولانا ظفر علی خان کی وجہ شہرت ایک صحافی کی حیثیت سے بھی مسلّم ہے۔ وہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ وہ 1873ء میں مولوی سراج الدین احمد کے گھر ضلع سیال کوٹ کے گاؤں کوٹ میرتھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عربی اور فارسی کے بڑے عالم تھے۔ مولانا ظفر علی خان نے ابتدائی تعلیم والدِ محترم سے حاصل کی۔ اس کے بعد مشن ہائی اسکول، ان کی درس گاہ بنی۔ اس اسکول میں نماز کا وقفہ نہیں ہوتا تھا اس بات کا افسوس ظفر علی خان کو افسوس تھا۔ انہوں نے ایک روز دوستوں کے ہم راہ اس کے خلاف احتجاج کیا، جس کے بعد دورانِ تعلیم نماز کا وقفہ منظور ہوا۔ میٹرک کے بعد والد کے حکم پر وہ سری نگر آ گئے، جہاں محکمہ ڈاک میں انہیں ملازمت مل گئی۔ لگتا تھا کہ قدرت نے انہیں ملازمت کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں کی رہ نمائی کے لیے پیدا کیا ہے۔ محکمہ ڈاک میں ایک انگریز نے ان کی بے عزتی کرنا چاہی تو انہوں نے اس کا خوب خوب جواب دیا۔ اس پر ان کی شکایت ہوئی اور انہیں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔

ملازمت کیا ختم ہوئی، انہوں نے دوبارہ اپنا رشتہ تعلیم سے جوڑ لیا۔ اس بار ان کی درس گاہ علی گڑھ کالج ٹھہری۔ انہوں نے یہاں سے 1895ء میں بی اے کیا۔ یہ بھی قدرت کی نوازش تھی کہ علی گڑھ میں علامہ شبلی نعمانی اور پروفیسر آرنلڈ جیسے عالم استادوں سے درس لینے کا موقع ملا۔ مولانا ظفر علی خان کا شمار اس وقت علی گڑھ کے ذہین اور لائق طالب علموں میں ہوتا تھا۔ اس وقت علی گڑھ کالج میں ان کے ہم جماعتوں میں ڈاکٹر ضیاء الدین، میر محفوظ علی بدایونی، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی جیسے نامل شامل تھے۔ ان ہی دنوں علی گڑھ کالج کے بانی اور مسلمانوں کے عظیم رہ

نما سر سید احمد خان حیات تھے۔ ان کی صدارت میں ایک روز علامہ شبلی نعمانی کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں سر سید احمد خان کی ملی اور قومی خدمات کو فارسی قصیدے کی صورت میں پیش کرنے کا موقع مولانا ظفر علی خان کو ملا۔ جسے سب نے ہی پسند کیا۔ اس وقت فرط مسرت سے سر سید احمد خان کا چہرہ چمک رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ ایک طالب علم ان کی تعریف کر رہا تھا، بلکہ اس لیے کہ وہ ادارے کے ایک طالب علم کی ایسی صلاحیت پر ناز کر رہے تھے جس کا مظاہرہ اس نے قصیدے کی صورت میں کیا۔ سر سید احمد خان جوش میں کھڑے ہوئے اور محبت سے اس طالب علم کو گلے لگاتے ہوئے کہا! ''ظفر علی خان، علی گڑھ کے ان ہونہار طلبہ میں سے ہیں جنھیں آگے چل کر ملک وقوم کی ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں۔ میں ان میں ایک روشن مستقبل کے آثار دیکھ رہا ہوں۔''

اس موقع پر علامہ شبلی نعمانی نے بھی ان کی بے حد حوصلہ افزائی کی۔ صحافت کا چسکا تو انہیں علی گڑھ میں ہی لگ چکا تھا۔ وہ علی گڑھ کالج کے میگزین ایڈیٹر تھے۔ سیاست کا درس بھی انہیں علی گڑھ سے ہی ملا۔ وہ وہاں کی طلبہ یونین کے جنرل سیکریٹری منتخب ہو چکے تھے۔ کسے معلوم تھا کہ علی گڑھ سے ملا ہوا یہ درس اور تربیت انہیں مستقبل میں ایک بڑا صحافی بنا دے گی اور وہ مسلمانوں کی آزادی کے لیے اپنے قلم کا بھرپور استعمال کریں گے۔

علی گڑھ سے فارغ ہونے کے بعد مولانا ظفر علی خان نے حیدر آباد دکن میں بھرپور صحافتی وقت گزارا۔ انہوں نے ترجمہ نگاری کے ساتھ ''دکن ریویو'' نکالا۔ اس میگزین نے کافی شہرت پائی۔ انہیں شاعری سے بھی بے حد لگاؤ رہا۔ حیدر آباد دکن کے بعد ان کی اگلی منزل بمبئی تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ اپنے آبائی علاقے کرم آباد چلے گئے۔ وہاں جانے کی وجہ ان کے والد مولوی سراج الدین احمد کی بیماری تھی۔ وہ ان کی خدمت میں مصروف رہے۔ مولوی سراج الدین احمد نے اخبار ''زمیندار'' نکالا تھا۔ وقتِ آخر انہوں نے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس اخبار کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ اب اس کی آب یاری کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔''

1909ء میں مولوی سراج الدین احمد انتقال کر گئے تو انہوں نے باپ سے کیا ہوا وعدہ نبھایا اور ''زمیندار'' اخبار کو سنبھال لیا۔ انہوں نے اس میں تبدیلی کرنے کا سوچا۔ سب سے پہلے تو اسے کرم آباد سے لاہور لے آئے۔ انہوں نے مسلمانوں کے حالات اور آزادی کی تحریک کو حوصلہ دینے کے لیے اپنا اخبار اور قلم، سب کچھ قربان کر دیا۔ بہت جلد یہ اخبار مسلمانوں کی آواز بن گیا۔ اس کی بے باکی کے قصے حکومتی ایوان میں گونجنے لگے۔

سچ اور کھری بات کہنے کے جرم میں زمیندار اخبار کو کئی بار بندش کا بھی سامنا کرنا پڑا، مگر زمیندار کی اشاعت میں کوئی تعطل (رکاوٹ) نہیں آیا۔ ان کی شاعری اور تقاریر سے بھی مسلمانوں میں آزادی کا شعور پیدا ہو رہا تھا۔ علامہ محمد اقبال نے انہیں ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا: ''مولانا ظفر علی خان کے قلم کی کاٹ اتاترک کی تلوار سے بھی زیادہ ہے۔'' (اتاترک ترکی کے رہ نما تھے)۔ ایک انگریز مائیکل ایڈوائیزر کا کہنا تھا: ''وہ بغاوت کا قلم لے کر پیدا ہوئے ہیں۔'' مولانا ظفر علی خان کانگریس سے مجلس احرار میں آئے اور اس کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے ممبر بنے اور آخر تک اپنا رشتہ مسلم لیگ سے برقرار رکھا۔

ان کے اخبار زمیندار سے وابستہ کئی قلمی شخصیات نے بعد میں صحافتی اور ادبی میدان میں عزت اور شہرت کمائی ان میں علامہ نیاز فتح پوری، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، مولانا مرتضیٰ احمد میکش، مولانا چراغ حسن حسرت، حاجی لق لق، آغا شورش کاشمیری اور نوائے وقت کے بانی حمید نظامی کے نام قابل ذکر ہیں۔

زمیندار اخبار کو تو ان کے والد مولوی سراج الدین احمد نے جاری کیا تھا جسے انہوں نے والد کی وفات کے بعد بے حد خوش اسلوبی سے آگے بڑھایا۔ اس کے علاوہ مولانا ظفر علی خان نے ''پنجاب ریویو'' اور ''ستارہ صبح'' بھی جاری کیے۔ آپ کو بابائے صحافت بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے کئی انگریزی کتابوں کو ترجمے سے اردو ادب میں منتقل کیا۔ ان میں خیابان فارس (لارڈ کرزن کی کتاب)، معرکۂ مذہب و سائنس (ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر)، جنگل میں منگل (رڈ یارڈ کپلنگ)، بحرظلمات (رائیڈر ہیگر) کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی کی مشہور کتاب ''الفاروق'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

ان کے مقالات کے مجموعے بھی انگریزی اور اردو میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے بھی ہیں۔ ان میں بہارستان، نگارستان اور چمنستان شامل ہیں۔ ان کی ایک مشہور زمانہ نعت کے اشعار:

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھی تو ہو

ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دُنیا تمھی تو ہو

27 نومبر 1956ء کو ان کا انتقال ہوا۔

☆☆☆



## ارنڈ

ارنڈ ایک چھوٹا درخت (shrub) ہے۔ جسے انگریزی میں Castor Oil پلانٹ، عربی زبان میں "خروع" اور فارسی زبان میں "کرچک" کہا جاتا ہے۔ اس پودے کا سائنسی نام "Ricinus



Communis" ہے۔ اس کا تعلق "Euphorbiaceae" خاندان سے ہے۔ عام لوگ اسے "Castor Bean" بھی پکارتے ہیں۔ یہ پودا سدا بہار پھول دار ہے جو 39 فٹ بلند (12 میٹر) تک ہو سکتا ہے۔ اس کے پتے 15 سے 45 سینٹی میٹر (6 سے 18 انچ) لمبے ہوتے ہیں۔ یہ پتے سبز سے لے کر سرخی مائل براؤن رنگت رکھتے ہیں۔ نر اور مادہ پھول الگ الگ ہوتے ہیں۔ نر (Male) پھول تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کا پھل کانٹے نما ابھار رکھتا ہے جو سبزی مائل (پک کر جامنی یا سرخی مائل) دکھائی دیتا ہے۔ اس پودے کی طبی اہمیت بھی ہے۔ اسے Castor Oil حاصل کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جو بیجوں (seeds) سے حاصل ہوتا ہے۔ اس تیل کا نقطہ کھولاؤ 313 سینٹی گریڈ (595 فارن ہائٹ) اور کثافت (Density) $961 Kg/m^3$ ہے۔ یہ تیل صابن، گاڑیوں کے تیل بریک آئل، رنگوں، ڈائیز، سیاہی، پلاسٹک، نائیلون، ادویات اور پرفیوم بنانے میں صنعتی طور پر استعمال ہوتا ہے۔

## شیر کا سر

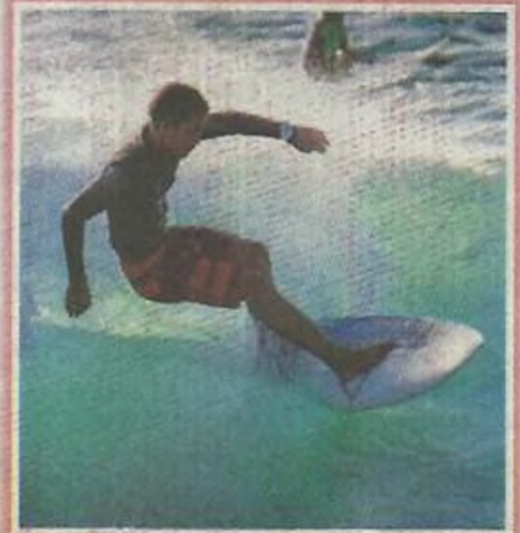
شیر کا سر (Lion's Head) ایک بت کا نام ہے جو فلپائن کے علاقے "Luzon" میں ایک معروف شاہراہ "Kenon Road" پر نصب ہے۔ اس بت کی شکل شیر کے سر سے مشابہ



ہے۔ یہ 40 فٹ (12 میٹر) بلند ہے۔ اس کے پاس سے گزر کر لوگ "Baglilo" شہر میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ بت اس Bagulo شہر کے میئر (Mayor) کی خصوصی کاوش سے بنایا گیا۔ اس کی تعمیر 1969ء میں شروع ہوئی جب کہ 1972ء میں اس کی رونمائی کر دی گئی۔ یہ بت سڑک کنارے ایک چٹان کو تراش کر بنایا گیا ہے۔ جس کا مقصد "Bagulo" شہر آنے والے سیاح کو متوجہ کرنا ہے۔ اس بت کا رنگ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل کیا جاتا رہا ہے۔ بھورا، سیاہ، پیلا، سرخ سمیت کئی رنگوں میں تبدیل کیا گیا۔ 1990ء میں فلپائن میں زلزلے کی وجہ سے اس کو نقصان پہنچا تھا جسے دوبارہ مرمت کر لیا گیا ہے۔ لائن ہیڈ (Lion's Head) کے نام سے جنوبی افریقہ کے علاقے کیپ ٹاؤن میں ایک پہاڑی بھی موجود ہے۔ جس کی بلندی 2195 فٹ (669 میٹر) ہے۔ جو نیشنل پارک کیپ ٹاؤن کا حصہ ہے۔ دنیا بھر سے ہر سال لوگ یہاں آتے ہیں۔

## موج رانی

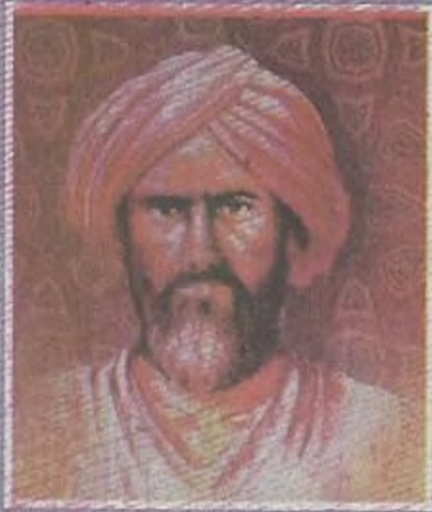
سمندر کی لہروں پر سواری کا کھیل موج رانی کہلاتا ہے۔ اس کھیل میں کھلاڑی سمندر کی تیز و بلند لہروں پر ایک تختے پر کھڑا ہو کر جوان مردی سے پانی کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کھیل کو انگریزی میں "Surfing" عربی میں "رکم جہ"، فارسی میں "موج سواری" کہتے ہیں۔ سمندر کی بلند و بالا اور تند و تیز لہروں پر اب تک پرتگال میں 78 فٹ (تقریباً 24 میٹر) بلند لہروں پر "Garret Mc Namara" نامی کھلاڑی نے ورلڈ ریکارڈ قائم کر رکھا ہے۔ اس کھلاڑی نے 2011ء میں یہ اعزاز حاصل کیا تھا۔ موج رانی یا موج سواری کا کھیل 18 ویں صدی عیسوی میں شروع ہوا۔ چوں کہ یہ مشکل کھیل ہے اسی لیے اس کھیل میں اترنے کے لیے سرف اسکول



اور سرف کیمپ قائم کیے جاتے ہیں۔ جہاں شوقین خواتین و حضرات کو ایک تختے یا "Softboard" پر کھڑے ہو کر لہروں پہ سواری سکھائی جاتی ہے۔ نئے کھلاڑیوں کو 7 سے 8 فٹ کے تختے پر کھڑا کیا جاتا ہے۔ شکل میں یہ کناروں سے پتلا اور درمیان سے چوڑا (کشتی نما) ہوتا ہے۔ مختلف انداز کی لہروں کے لیے ان سوفٹ بورڈ کی جسامت و شکل میں رد و بدل بھی کیا جاتا ہے۔ اسی لیے یہ بورڈ 6 فٹ سے 15 فٹ لمبائی کے ہو سکتے ہیں۔ بڑی لہروں پہ سواری کے لیے استعمال ہونے والے تختے کو "Gun" کہتے ہیں۔ یہ 7 سے 12 فٹ لمبا ہوتا ہے۔ ان بورڈز کو محفوظ رکھنے کے لیے سطح پر "Wax" (موم) لگائی جاتی ہے۔ اس کھیل میں ڈوبنے کے علاوہ چٹانوں، شارک، جیلی فش وغیرہ سے بھی نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے۔

## ابنِ خلدون

ابن خلدون ایک معروف مسلمان مورخ، فلسفی اور سیاست دان گزرے ہیں۔ آپ 27 مئی 1332ء کو (تونس) "Tunis" میں پیدا ہوئے۔ "مقدمۂ ابن خلدون" نامی کتاب کے مصنف نے اعلیٰ تعلیم یونی ورسٹی آف Ez-Zitonu سے حاصل کی۔ آپ کا مکمل نام ابو زید عبدالرحمٰن بن محمد بن خلدون الحضرمی ہے۔ آپ کے آباؤ اجداد یمن سے تھے۔ ابن خلدون نے 20 برس کی عمر میں سیاست شروع کی لیکن مطالعہ کے لیے تاریخ، سوشیالوجی، اکنامکس، انسانی



آبادی اور پولیٹکل سائنس کو پسند کیا۔ ابن خلدون کی عمر صرف 17 برس تھی کہ والدین طاعون (Plague) کی بیماری کے باعث وفات پا گئے۔ 1377ء میں ابن خلدون نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب مقدمۂ ابن خلدون سے دنیا کو متوجہ کیا۔ انگریزی میں اس کتاب کو ابن خلدون "Prolegomena" بھی کہتے ہیں۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ معروف ادیب و شاعر "ابو الخیر کشفی" نے کیا۔ بعد ازاں "مولانا راغب رحمانی" نے بھی مقدمۂ ابن خلدون کا ترجمہ شائع کیا۔ آپ کی یاد میں تیونسی دینار پر آپ کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ آپ جیسے عظیم فلسفی نے 17 مارچ 1406ء (73 برس کی عمر) میں انتقال کیا۔ مصر کے شہر قاہرہ میں (آپ کی جائے وفات) ایک مجسمہ بنا کر نصب کیا گیا ہے۔ اس عظیم انسان کے والد کا نام محمد بن خلدون تھا۔ ابن خلدون کا تذکرہ یورپی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ ☆☆




نام تو نجانے ان کا کیا تھا پر محلے بھر میں وہ میاں گپستان کے نام سے مشہور تھے۔ وہ لمبی لمبی چھوڑتے تھے۔ بڑ بولنے اور شیخی مارنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ بات اس اعتماد، تسلسل اور پکے پن سے کرتے کہ گویا واقعی حقیقت پر مبنی واقعہ بیان کر رہے ہوں۔

ایک دفعہ کسی عزیز کو چھوڑنے ہوائی اڈے گئے تو واپس آ کر کہنے لگے۔ ''میرا ایک چچازاد بھائی پائلٹ ہے بس وہ اصرار کر کے ہوائی جہاز کے اندر لے گیا۔ مجھے کہا ٹرائی کرو۔ میں نے کئی بٹن دبائے۔ آخرکار جہاز چل پڑا۔ میں نے پانچ منٹ تک جہاز اڑایا پھر اس کو زمین پر بھی میں ہی لے آیا۔''

لڑکے یہ بات سن کر خوب ہنسے، خوب کھی کھی ہوئی۔ وکی ہنس کر بولا۔ ''چھوڑ بھائی! بریکیں وریکیں تو خوب کام کر رہی تھیں نا جہاز کی؟'' کہیں ٹائر پنکچر تو نہیں کر آئے؟''

میاں گپستان بولے۔ ''واہ وکی بھائی، پائلٹ میری رہنمائی کر رہا تھا ٹائروں کے بارے میں اس نے بتایا کہ بالکل فٹ فاٹ ہیں۔'' اہل محلہ نے خوب مزہ لیا۔

اگلے ہفتے کا واقعہ ہے۔ میاں گپستان انارکلی بازار تشریف لے گئے۔ وہاں ایک جاننے والے دکان دار نے ان کو اپنی دکان پر بٹھا لیا اور شربت سے تواضع کی۔ میاں گپستان جب محلے میں آئے تو افتخار صاحب نے پوچھا۔ ''میاں گپستان آج صبح کہاں گئے تھے؟''

''افتخار بھائی انارکلی بازار میں بھائی اشرف جو سنار ہیں، میرے ماموں زاد ہیں، انہوں نے اپنے پاس بٹھا لیا۔ پیپسی، برگر، بریانی اور سوجی کا حلوہ کھلایا۔ میں نے تو آج اتنا کھایا ہے کہ ناک تک بھر گیا ہوں۔'' میاں گپستان نے فخر سے بتایا۔ افتخار صاحب نے ہنس کر کہا۔ گپستان میاں تھوڑا سا حلوہ اور برگر ہمارے لیے بھی لے آتے۔''

ایک دفعہ بیٹھک میں میاں گپستان محلے کے تمام لڑکوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ہر لڑکا اپنی تعلیمی کارکردگی بتا رہا تھا۔ حسب معمول میاں گپستان خوب ترنگ میں تھے فرمایا۔ ''ارے میاں میں تو اتنا لائق تھا کہ تمام استاد میری عزت کرتے تھے۔ پوری کلاس مرغا بنی ہوئی تھی لیکن میں بیٹھا رہتا تھا۔ ہمیشہ اول پوزیشن حاصل کی۔'' حبیب بولا۔ ''میاں گپستان دسویں میں اول پوزیشن آنے پر آپ کے کتنے میں سے کتنے نمبر تھے؟'' میاں گپستان نے لمبی پھینکی۔ حبیب بھائی آٹھ سو بٹا آٹھ سو نمبر لے گیا تھا میں۔ خوب فوٹو شوٹو بنے تھے۔ صوبے کا گورنر خود انعام دینے آیا تھا۔''

”واہ، واہ، واہ“ سارے لڑکے ہنستے جاتے تھے اور ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے جاتے تھے۔ ایک دفعہ میاں گپستان نے تمام بچوں کو اکٹھا کیا اور بولا۔ ”نوجوانی میں، میں بڑی زبردست کرکٹ کھیلا کرتا تھا۔ اپنی ٹیم کا آل راؤنڈر تھا آل راؤنڈر۔ آج بھی اعلیٰ پائے کا کھلاڑی ہوں۔“

پپو بولا۔ ”میاں گپستان آج کرکٹ کھیلتے ہیں۔ آپ بیٹنگ کریں۔“ میاں گپستان کریز پر آئے۔ پہلی گیند ان کے پیٹ کو لگی، دوسری گیند ان کے گھٹنے پر لگی اور تیسری گیند پر وہ کلین بولڈ (وکٹوں میں بال لگنا) ہو گئے۔

”ہرا!“ بچوں نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ میاں گپستان شرمندہ ہونے والوں میں سے کہاں تھے۔ بولے۔ ”میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ پچ (وکٹوں کا درمیانی فاصلہ) ٹیڑھی تھی۔“

میاں گپستان عجیب وغریب باتیں بنانے کے ماہر تھے۔ ایک دفعہ فرمانے لگے۔ ”مجھ میں کچھ ایسی طاقتیں ہیں کہ جانور مجھے دیکھتے ہی مجھ سے مانوس ہو جاتے ہیں اور میرے پیر چاٹنے لگتے ہیں۔“ ہفتے کی روشن صبح تھی۔ میاں گپستان بازار سے سودا سلف لے کر گھر کی طرف آرہے تھے۔ کچھ آوارہ کتے ان کے پیچھے چل پڑے۔ اب حال یہ تھا کہ میاں گپستان گھبرا کر بھاگے۔ کتے بھی ان کے پیچھے بھاگے۔ سارا سامان ان کے ہاتھ سے گر کر ادھر ادھر بکھر گیا۔ میاں گپستان کسی کے گھر کی ڈیوڑھی میں جا گھسے۔ وہاں ایک عورت ٹھہری ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”او پاگل کے بچے، انسان بنو، پرائے گھر کیوں منہ اٹھا کر گھسے آرہے ہو؟“

اب میاں گپستان کا وہ حال کہ کاٹو تو لہو بدن میں نہیں۔ باہر کتے تھے اور اندر وہ کرخت عورت۔ بہر حال بڑی مشکل سے گلو خلاصی ہوئی۔ اسی اثناء میں رفیق اور عامر نے کتوں کو بھگا دیا۔ میاں گپستان کو دو ٹماٹروں اور تین آلوؤں کے علاوہ اپنا سامان نہ مل سکا۔ یہ سزا قدرت نے انہیں جھوٹ بولنے کی دی تھی۔ میاں گپستان نے تہیہ کیا کہ آئندہ جھوٹ بولنے سے پرہیز کریں گے۔ وہ دن اور آج کا دن، میاں گپستان کو اہلِ محلہ اب ان کے اصل نام ”شکیل احمد“ سے پکارتے ہیں۔ اب میاں گپستان سدھر چکے ہیں۔

☆☆☆

## دیانت دار تاجر

حضرت سیدنا سری سقطیؒ تجارت کیا کرتے تھے۔ آپؒ نے یہ عہد کیا ہوا تھا کہ کبھی تین دینار سے زیادہ نفع نہیں لوں گا۔ ایک مرتبہ آپؒ نے 60 دینار کے 96 صاع بادام خریدے اور پھر انہیں فروخت کرنے لگے۔ آپؒ نے 96 صاع بادام کی قیمت تین دینار نفع شامل کر کے 63 دینار رکھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک تاجر آپؒ کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ”میں یہ بادام خریدنا چاہتا ہوں۔“ آپؒ نے کہا۔ ”خرید لو۔“ اس نے قیمت دریافت کی تو آپؒ نے فرمایا کہ 63 دینار میں فروخت کروں گا۔ اس تاجر نے آپؒ کو بتایا کہ بازار میں 96 صاع بادام کی قیمت 90 دینار ہو گئی ہے لہٰذا آپ بہت کم قیمت پر فروخت کر رہے ہیں۔ آپؒ نے فرمایا کہ میں نے اللہ سے وعدہ کیا ہے کہ کبھی بھی تین دینار سے زیادہ منافع نہیں لوں گا۔ اگر خریدنا چاہتے ہو تو خرید لو۔ دوسرا تاجر بھی دیانت دار تاجر تھا وہ اپنے مسلمان بھائی کو نقصان میں رکھ کر بادام نہیں خریدنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ میں نے بھی اللہ سے وعدہ کیا ہے کہ کبھی بھی اپنے مسلمان بھائی کو دھوکہ نہیں دوں گا، کبھی بھی بددیانتی نہیں کروں گا۔ لہٰذا میں بادام 90 دینار میں ہی خریدوں گا اس سے کم ایک دینار بھی نہیں دوں گا مگر وہ بزرگ 63 دینار سے زیادہ پر فروخت کرنے پر رضامند نہیں ہوئے اور نہ دوسرے بزرگ 90 دینار سے کم دینے کو تیار ہوئے۔ یوں ان دونوں کے درمیان سودا طے نہ پایا۔ اور دوسرے بزرگ وہاں سے چلے گئے۔

یہ تھے ہمارے بزرگ کس قدر ایمان داری اور دیانت داری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کے زمانے میں ہماری معیشت اور خوش حالی بھی عروج پر تھی۔ ہماری خوش حالی اور اچھے حالات انہیں لوگوں کی ایمان داری، دیانت داری اور سخاوت کا نتیجہ تھی۔ اگر آج بھی ہم اپنے ملک اور اپنی معیشت کو عروج پر دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے اسلاف کی عادتوں کو اپنانا ہوگا۔ اپنے فرائض کو ایمان داری اور دیانت داری سے سرانجام دینا ہوگا۔ (سید ابوبکر کاظمی، لاہور)

# کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔



یہ ایک فائیو سٹار ہوٹل ہے۔ اس ہوٹل کے ایک کمرے میں مسٹر اظہر الدین ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مسٹر اظہر الدین ناشتا کرنے کے بعد صبح کا اخبار پڑھ رہے تھے۔ اسی وقت کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ مسٹر اظہر الدین نے اخبار ایک طرف رکھی اور اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دروازے پر ایک صاحب کھڑے تھے۔

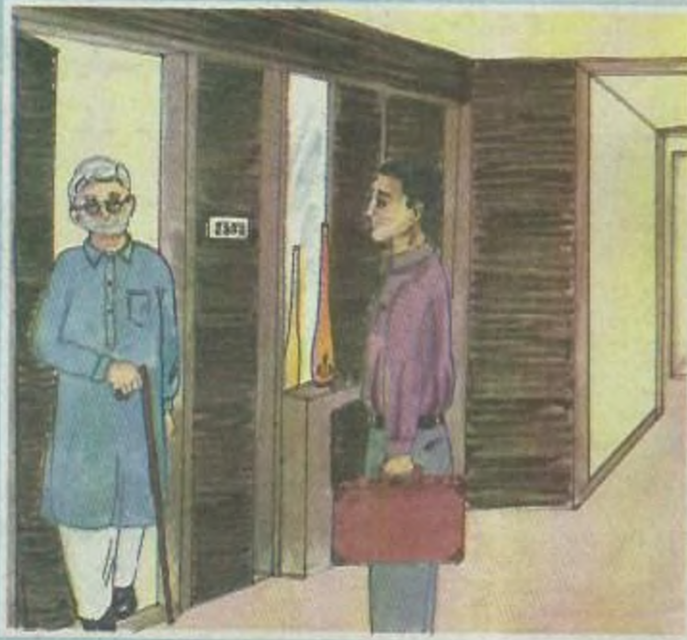
"جی فرمایئے؟ آپ کون؟ اظہر الدین نے پوچھا۔

"اوہ!" معذرت چاہتا ہوں۔ میں سمجھا یہ میرا کمرہ ہے۔"

یہ کہہ کر وہ صاحب آگے کو چل دیئے۔ لیکن اظہر الدین سوچ میں پڑ گئے۔ حیران بھی ہوئے کہ اگر یہ ان صاحب کا کمرہ ہے تو......؟؟؟

اظہر الدین نے اسی وقت انٹر کام کے ذریعے ہوٹل کے مینیجر سے پولیس کو اس واقع کی اطلاع دینے کا کہا۔

پیارے بچو! مسٹر اظہر الدین نے پولیس کو ان صاحب کے متعلق کیا شبہ تھا کہ انہوں نے پولیس کو بتانا ضروری سمجھا۔ چند لمحے سوچیے تو آپ کو فوراً جواب ملے گا۔



فروری 2018ء کا جواب: 5 گولیاں کھانے میں 2 گھنٹے لگیں گے۔

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے پانچ ساتھیوں کو بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

1- اسد الرحمٰن شریف، سرائے عالم گیر
2- محمد بلال، لاہور کینٹ
3- تاباں زینب، سرگودھا
4- علی حسنین انجم، لاہور
5- موسیٰ اکبر، اسلام آباد




''اختر وہ دیکھو دیوار پر کبوتر بیٹھا ہے، جلدی سے پکڑو کہیں اڑ نہ جائے۔'' اکبر کے کہتے ہی اختر پھرتی سے کبوتر پر جھپٹا اور اسے قابو کرلیا۔

''اکبر بھائی اس کے تو پر بھی کاٹنے پڑیں گے ورنہ یہ بھی کل والے کبوتر کی طرح اڑنے میں دیر نہیں کرے گا۔'' اختر نے اکبر سے کہا اور قینچی لے کر اس کبوتر کو لٹا دیا۔

''رک جاؤ اختر، کیوں اس بے زبان پرندے کو اس طرح تکلیف دے رہے ہو۔'' یہ آواز سن کر اختر ایک دم رک گیا اور گردن گھما کر پیچھے دیکھا تو ان کے ابو ناصر میاں کھڑے تھے۔

اختر نے ناصر میاں کو دیکھتے ہی کبوتر کو چھوڑ دیا اور کبوتر پھڑ پھڑاتا ہوا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

اکبر اور اختر ناصر میاں کے بیٹے ہیں۔ اکبر بڑا جب کہ اختر چھوٹا اور آخری بیٹا ہے اس کے بعد ناصر میاں کی کوئی اولاد نہیں۔ اختر کے پیدا ہوتے ہی ناصر میاں کی بیوی اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔ ناصر میاں نے دونوں بیٹوں کو کبھی ماں کی کمی نہیں محسوس ہونے دی۔ ناصر میاں خواہش تھی کہ دونوں بیٹے زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کریں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں لیکن ناصر میاں کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور ان کا ایک بیٹا بھی پرائمری سے آگے نہ پڑھ سکا۔ ناصر میاں بیٹوں کو سمجھاتے کہ آج کل کے دور میں کوئی کسی کا نہیں، ہر کسی کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑتا ہے اس لیے بہتر ہے فضول کام چھوڑو اور اپنا کوئی کاروبار کرو۔

''ناصر میاں کو کبوتر بازی سے چڑ تھی جب کہ ان کے دونوں بیٹے کبوتروں کے شوقین تھے۔ ناصر میاں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی وہ کبوتروں کو پکڑ لیتے اور ان کے پر کاٹ کر قید کر لیتے پھر کچھ دنوں بعد جب ان کے پر نکل آتے تو انہیں اڑاتے رہتے۔

آج ناصر میاں نے انہیں پر کاٹتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور یہ فیصلہ کیا تھا کہ آج کے بعد دونوں بھائی ان کے ساتھ کپڑوں کی دکان پر جایا کریں گے جو ناصر میاں نے اپنے گھر کے نزدیک بازار میں کھولی ہوئی تھی۔ دکان زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن اس دکان کی سیل اور دکانوں سے زیادہ تھی۔ اس کی ایک یہ وجہ بھی تھی کہ ناصر میاں ہمیشہ اچھی کوالٹی کا کپڑا فروخت کرتے تھے اور دوسری دکانوں کے مقابلے میں ان کا ریٹ بھی جائز ہوتا جو گاہک بغیر بحث کیے دے دیتے تھے۔

آج شام کو جب ناصر میاں دکان پر گئے تو دونوں بیٹوں کو

بھی ساتھ لے گئے اور انہیں کپڑوں کی قیمتوں کے بارے میں بھی بتا دیا۔ آج ناصر میاں آرام کرنے لگے اور ان کے بیٹوں نے دکان سنبھالی۔

اب روزانہ ناصر میاں بیٹوں کو دکان پر بٹھا کر خود گھر آ جاتے اور جب شام کو دکان پر جاتے تو بیٹوں کی کام میں دل چسپی دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ ایک دن ناصر میاں گھر تھے، اکبر ادھار وصول کرنے گیا ہوا تھا اور اختر دکان پر اکیلا تھا۔ اختر نے دیکھا کہ ایک آدمی کبوتروں کا جوڑا لیے بازار سے گزر رہا ہے تو اختر نے جلدی سے اسے روک لیا اور وہ کبوتروں کا جوڑا خرید لیا۔ خوب صورت کبوتروں کو دیکھ کر اختر نے سوچا ان کے پر کاٹ لینے چاہئیں ورنہ یہ اڑ جائیں گے۔ اختر نے قینچی اٹھائی اور ایک کبوتر کے پر کاٹنے لگا جب کہ دوسرا کبوتر موقع پاتے ہی اڑ گیا۔

اختر کو جب معلوم ہوا کہ ایک کبوتر اڑ گیا ہے تو وہ جلدی سے باہر کی طرف لپکا اور کبوتر کی تلاش میں بازار میں دوڑ لگا دی۔ کافی دور جانے کے بعد جب کبوتر نہ ملا تو اختر واپس پلٹا۔ تب اسے احساس ہوا کہ دوسرا کبوتر بھی اڑ جانے میں کام یاب ہو گیا ہے۔

اختر نے اب دکان کی طرف دوڑ لگائی اور جلدی سے دکان میں پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ چند لٹیرے دکان کا صفایا کر گئے، جب کہ دوسرے دکان دار صرف چلاتے ہی رہ گئے ہیں۔ کچھ دیر بعد ناصر میاں وہاں پہنچے تو غصے سے آگ بگولہ ہو رہے تھے۔ آتے ہی جب اختر سے پوچھا کہ وہ اس وقت کہاں تھا جب ڈکیتی ہوئی تو اختر نے جھوٹ بول دیا کہ وہ قریبی مسجد میں نماز ادا کرنے گیا تھا اور دکان کو تالا لگانا بھول گیا۔

اس سے پہلے کے ناصر میاں پولیس کو فون کرتے ان کا موبائل فون بج اٹھا۔ ناصر میاں نے جب فون سنا تو ان کے اوسان خطا ہونے لگے، وہ نیچے گرنے والے تھے کہ اختر نے انہیں سہارا دے کر بٹھایا اور موبائل فون لے کر سنا۔

اختر نے جب موبائل فون کان سے لگایا تو بے اختیار چونک پڑا کیوں کہ دوسری جانب سے کہا گیا تھا کہ اکبر کبوتر کا پیچھے کرتے ہوئے گڑھے میں گر گیا ہے اور اس نے ایک ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔

اختر نے جلدی سے اسپتال کا پتا پوچھا اور دکان بند کر کے ناصر میاں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔

اسپتال پہنچنے پر انہیں بتایا گیا کہ ابھی اکبر ایمرجنسی وارڈ میں ہے کیوں کہ اس کے دماغ پر بھی اس چوٹ کا اثر ہوا ہے اس لیے چند گھنٹوں بعد اس سے بات کرنے کی اجازت دی جائے۔

ناصر میاں کے لیے لحہ لحہ قیامت کی طرح گزر رہا تھا اور اپنے بیٹے کے لیے زار و قطار روتے ہوئے دعائیں مانگ رہے تھے۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد ایک ڈاکٹر باہر آیا اور ناصر میاں سے کہا کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں، آپ مریض سے بات کر سکتے ہیں۔ ناصر میاں اور اختر جیسے ہی اندر داخل ہوئے اکبر انہیں دیکھ کر بولا۔ ”ابو مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کی بات نہیں مانی اس لیے آج یہ دن دیکھنا پڑا۔“

”بیٹے پر یہ سب ہوا کیسے؟“ ناصر میاں نے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

”ابو جان میں کپڑوں کی ادھار وصول کرنے گیا ہوا تھا کہ میں نے دیکھا دو خوب صورت کبوتر دیوار پر بیٹھے تھے، اتنے خوب صورت کبوتر دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں انہیں پکڑنے کے لیے بھاگا۔ مجھے دیکھ کر وہ اڑنے لگے تو میں اور بھی تیزی سے ان پر جھپٹا لیکن دیوار کے ساتھ گڑھے میں میرا پاؤں پھسلا اور میں گر گیا۔“ اکبر کی بات سن کر اختر سمجھ گیا کہ یہ خوب صورت کبوتر وہی ہوں گے جو مجھ سے اڑ گئے تھے۔

اختر نے ناصر میاں کو سچ سچ بتا دیا۔ ناصر میاں انہیں شرمندہ دیکھ کر بولے۔ ”بیٹے پرندوں کو قید نہیں کرنا چاہیے اور ویسے بھی کبوتر بازی شیطانی مشغلہ ہے۔“ ناصر میاں کچھ دیر توقف کے بعد بولے۔ ”حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار حضورﷺ نے ایک آدمی کو کبوتر کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ”ایک شیطان دوسرے شیطان کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔“ ☆☆☆

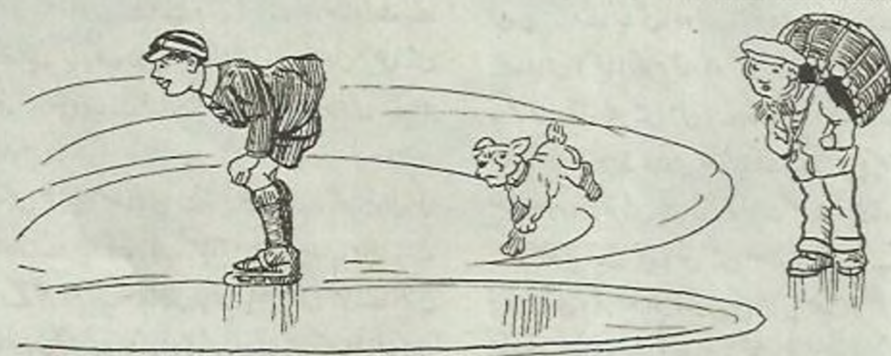
**میری بیاض سے**

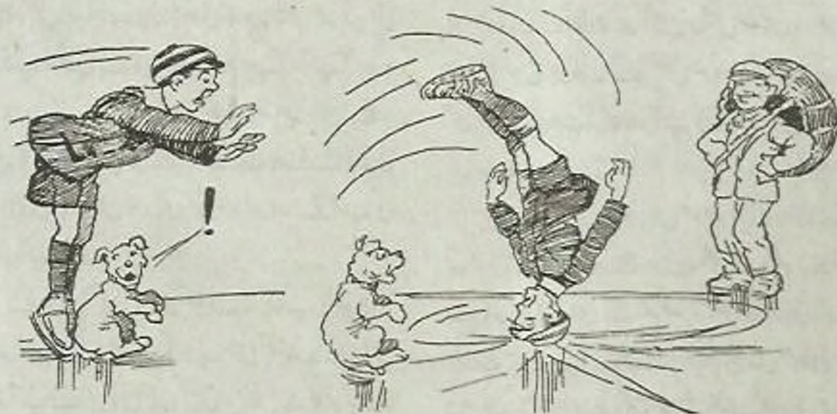
خواہش سے نہیں گرتے پھل جھولی میں
وقت کی شاخ کو میرے دوست ہلانا ہو گا
کچھ نہیں ہو گا اندھیروں کو برا کہنے سے
اپنے حصے کا دیا خود ہی جلانا ہو گا

(مریم مقصود، فیصل آباد)

# کہانی بنائیے!








پیارے بچو! ان تصاویر کو دیکھ کر اچھی سی کہانی بنائیے اور اپنی والدہ صاحبہ یا استانی صاحبہ کو دکھا کر شاباشی لیجیے۔




بچو! دیگر علوم کی طرح مسلمانوں نے علم جغرافیہ کو یونانیوں سے حاصل کیا اور پھر اس علم میں اس قدر اضافہ کیا کہ اس کی ہیئت بدل کر رکھ دی، مسلمانوں نے اپنے وسیع تجربات اور مشاہدات سے علم جغرافیہ کو ایک نیا رنگ روپ عطا کیا اور اس کی دل چسپی میں بھرپور اضافہ کیا، یہی وجہ ہے کہ ان مسلمانوں جغرافیہ دانوں کے نام زبان زد عام ہیں۔

بچو! جس طرح مسلمانوں نے یونانیوں کے علم جغرافیہ کی آبیاری کی اور اسے نیا رنگ روپ دیا، اسی طرح یورپ والوں نے مسلمانوں کے علم جغرافیہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس علم سے بخوبی استفادہ کیا اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یورپ میں علم جغرافیہ کو جو ترقی نصیب ہوئی، وہ مسلمان جغرافیہ دانوں کی مساعی اور مسلسل کاوش کی مرہون منت ہے۔

آپ 897ء میں پیدا ہوئے۔ یعقوبی کا پورا نام احمد بن ابی یعقوب تھا، لیکن آپ یعقوبی کے نام سے مشہور ہوئے، آپ مشہور و معروف جغرافیہ دان گزرے ہیں، آپ فطرتاً جغرافیہ دان تھے۔ آپ کو علم جغرافیہ کا موجد کہا جاتا ہے، آپ کے بعد آنے والے مسلمان جغرافیہ دانوں بالخصوص ادریسی اور ابو لفداء نے آپ کی کتب سے استفادہ کیا ہے۔

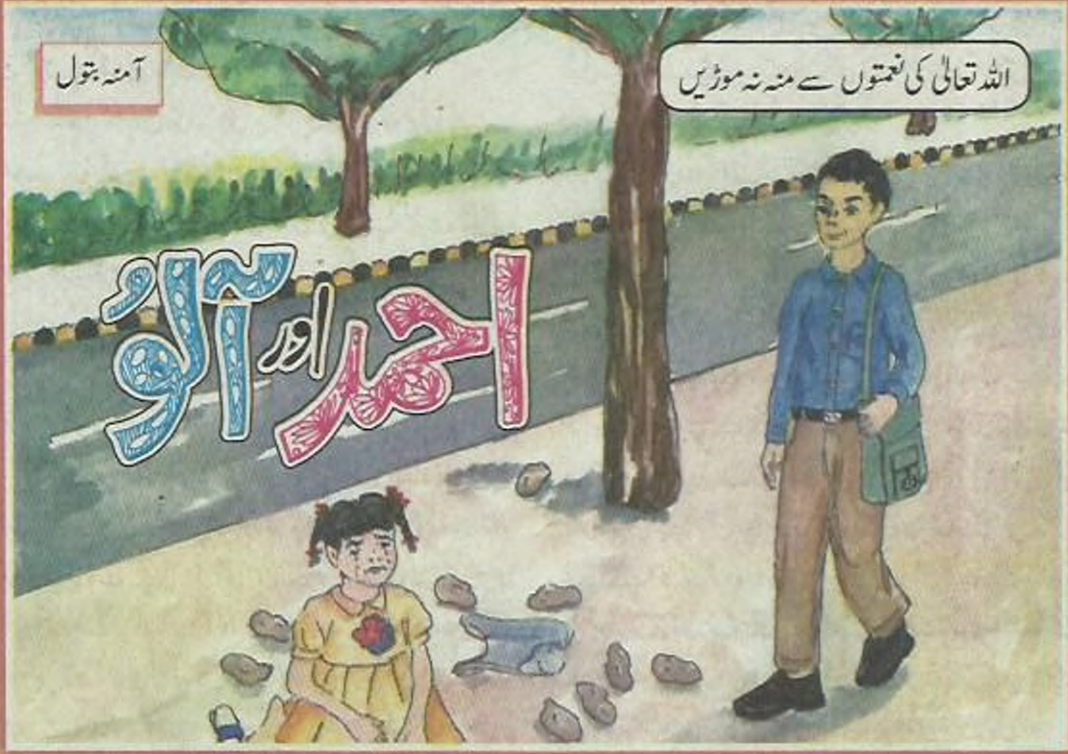
بچو! آپ نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''کتاب البلدان'' 276ھ، 891ء میں لکھی، یہ جغرافیہ کی ایک اعلیٰ تصنیف ہے، اس کتاب کے لیے آپ نے برسوں تک تحقیق و جستجو سے کام کیا اور سیاحوں سے مل کر معلومات حاصل کرتے رہے، آپ نے جغرافیائی حقائق کی نشان دہی کی اور اعداد و شمار تحریر کیے، آپ شہروں کے فاصلوں کو دنوں میں ظاہر کرتے ہیں اور سفروں کے حالات بیان کرتے ہیں۔ خاص طور پر ٹیکسوں کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں، شہروں میں بغداد اور سمارا شہروں کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔

بچو! یعقوبی اپنی کتاب ''کتاب البلدان'' میں اپنے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اوائل شباب سے لے کر اس وقت تک جب کہ دماغ میں ذہانت و فطانت زیادہ ہوگئی ہے، مجھے ممالک کی تاریخ اور ان کے جغرافیائی حالات دریافت کرنے کا بے حد شوق تھا، کیوں کہ بچپن ہی سے میں نے دور دراز علاقوں کے سفر کیے تھے، جب کبھی بھی مجھے کسی دور کے علاقے کے باشندے سے ملنے کا اتفاق ہوتا تو میں اس سے اس کے وطن کا نام پوچھے بغیر نہ رہ سکتا، بعد ازاں میں وہاں کے لوگوں کے حالات دریافت کرتا کہ وہ عرب تھے یا عجمی، ان کی زراعت کیا تھی، وہ اپنے مشروبات کہاں سے حاصل کرتے تھے، لباس کا کیا انتظام تھا، وہ کس فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، ان کا حاکم کون تھا، پھر میں اس کے ملک کی وسعت کے بارے میں سوال کرتا اور ملحقہ علاقوں اور ممالک کے نام پوچھتا، اگر وہ شخص معتبر معلوم ہوتا تو میں اس کے جوابات قلم بند کر لیتا۔

یعقوبی ایک سنجیدہ اور متین مصنف تھے۔ آپ اپنے ہم عصر خردازبہ اور دیگر جغرافیہ دانوں کی طرح بعید از عقل افسانوں اور حکایتوں سے کوئی دل چسپی نہ رکھتے تھے، یعقوبی مشرق اور مغرب کے متعدد باخبر لوگوں سے ایام حج اور دیگر وقتوں میں مختلف سوالات کرتے اور پھر ان سوالات کے جوابات حاصل کرتے، اس طرح جو معلومات اور اطلاعات انہیں حاصل ہوتیں وہ لکھ لیتے تھے، چناں چہ اس طرح ہر ملک کے متعلق ضروری کوائف درج کرتے رہے، حتیٰ کہ ایک مدت کے بعد آپ کی کتاب مکمل ہوئی جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

بچو! یعقوبی کے تصور میں علم جغرافیہ کا دائرہ بہت وسیع تھا آپ قدیم زمانے میں ہوتے ہوئے بھی اس علم سے آگاہ تھے۔ جس کے بارے میں ان کے ہم عصر ''جغرافیہ انسانی'' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، آپ کے عہد میں ایام حج میں مسلمانوں کا اجتماع عظیم نہ صرف مذہبی اہمیت رکھتا تھا بلکہ مختلف اسلامی ممالک میں تجارتی اور تمدنی تعلقات پیدا کرنے کا ایک بڑا ذریعہ تھا، سیاح مؤرخین اور مصنفین ضروری معلومات حاصل کرنے کے لیے فریضہ حج کو ایک زریں موقع خیال کرتے تھے۔ آپ کی وفات 284ھ بمطابق 897ء کو ہوئی۔ ☆☆☆




بریک کی گھنٹی بجتے ہی احمد نے بے تابی سے لنچ باکس کھولا اور پھر مرے مرے انداز میں دوبارہ بند کر دیا۔ اس کی بھوک مٹ گئی تھی۔ ساتھ بیٹھے عادل سے یہ بات چھپی نہ رہی سو پوچھ لیا۔ ''کیا ہوا احمد؟'' اور احمد کو تو گویا دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا۔ ''دیکھو ذرا، امی نے آلو کی بھجیا دی ہے، زہر لگتے ہیں مجھے آلو!''

عادل ہنس پڑا، اسے آلو بے حد پسند تھے۔ ''ایسا کرتے ہیں لنچ بدلتے ہیں، مجھے ابو جی نے پیسے دیے ہیں، تم اس کا اپنے لیے کینٹین سے کچھ لے لینا، میں تمہارا لنچ کھا لیتا ہوں۔''

احمد کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''شکریہ دوست۔''

کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بالآخر وہ تین سموسے خریدنے میں کام یاب ہو ہی گیا، مگر کھاتے ہوئے پھر منہ بن گیا۔ ''پھر آلو......'' وہ بڑبڑایا اور سموسے سے آلو نکال کر ایک جانب اچھال دیا، کچھ کیاری میں گرا، کچھ گراؤنڈ میں ہی گر گیا۔ بچا کھچا سموسہ کھانے کے بعد اس نے کلاس کا رخ کیا۔ سموسوں میں اچھی خاصی مرچیں تھیں، اس کے پیٹ میں درد سا ہونے لگا تھا۔ ''کوئی بات نہیں، گھر جا کر ڈھیر سارا کھانا کھا لوں گا۔'' احمد نے خود کو تسلی دی۔

چھٹی ہوئی تو دیگر بچوں کے ساتھ احمد بھی گھر کو روانہ ہوا۔ اس کا گھر زیادہ دور نہیں تھا اس لیے وہ پیدل ہی آتا جاتا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک چھوٹی سی بچی پر پڑی جو رو رہی تھی۔ احمد کا دل پسیج گیا۔ امی جان نے بتایا تھا کہ مصیبت زدوں کی مدد کرنا بہت ثواب کا کام ہے۔ احمد نے پوچھا۔ ''کیا ہوا بہنا؟''

بچی نے حیرت سے اسے دیکھا اور زور و شور سے رونے لگی، ساتھ ہی ہاتھ میں پکڑا شاپر دکھایا، شاپر پھٹا ہوا تھا۔ غور سے دیکھنے سے پتا چلا کہ آس پاس آلو بکھرے ہوئے ہیں۔ احمد سمجھ گیا کہ شاپر پھٹنے سے آلو گر گئے ہیں جس کی وجہ سے بچی پریشان ہو کر رو رہی ہے۔

''ارے بہنا کیوں اداس ہوتی ہو؟ یہ لو ابھی سارے آلو جمع کر دیتا ہوں، مگر گھر کیسے لے کر جاؤ گی؟ ایسا کرو جھولی پھیلاؤ، میں اس میں آلو ڈالتا جاتا ہوں۔'' بچی نے آنسو پونچھتے ہوئے جھولی پھیلا دی۔ احمد ایک ایک آلو اٹھا کر اس کی جھولی میں ڈالتا رہا۔ یہاں تک کہ سب آلو جمع ہو گئے۔ اب بچی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ''شکریہ اچھے بھیا!''

احمد بھی مسکرا دیا۔ ''شکریہ کی کوئی بات نہیں، ہاں آئندہ خیال رکھنا، گھر سے مضبوط تھیلا ساتھ لینا۔''

بچی نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے گھر کو روانہ ہوگئی تو احمد نے بھی اپنے گھر کی جانب قدم موڑ لیے۔

''السلام علیکم امی جی۔'' امی پر نظر پڑتے ہی وہ بولا، پھر بستہ کمرے میں رکھ دیا۔ ''امی جی بھوک لگی ہے بہت، جلدی کھانا لگا دیں۔'' امی نے کہا۔ ''ابھی لگاتی ہوں بیٹا، آپ کپڑے تبدیل کریں اور ہاتھ منہ دھولیں۔''

احمد نے ایسا ہی کیا، ہاتھ منہ دھو کر نکلا تو امی کھانے کی میز پر اس کی منتظر تھیں۔ جیسے ہی اس کی نظر پلیٹ میں موجود سالن پر پڑی، اس کا منہ لٹک گیا۔

''مجھے نہیں کھانا۔'' احمد اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

''ارے ابھی تو بھوک کا شور مچا رہے تھے اور ابھی کھانا نہیں کھانا، یہ کیا بات ہے؟'' امی بھی اس کے پیچھے کمرے میں آ گئیں۔

احمد پھٹ پڑا۔ ''روز آلو...... روز آلو...... زہر لگتے ہیں مجھے آلو، ہر وقت آلو ہی بناتی ہیں اور تو چھوڑیں آج تو لنچ میں بھی آلو رکھ دیے تھے۔''

امی کچھ دیر خاموش رہیں، پھر کہا۔ ''بیٹا سودا ختم ہو گیا تھا، تمہارے ابو سے لانے کو کہا تھا مگر وہ بھول گئے تھے اور کچھ تھا نہیں، اس لیے آلو بنا لیے اور روز روز کی بھی خوب کہی، پورے ایک ہفتے کے بعد آج آلو بنے ہیں۔ آپ ناشکری کر رہے ہیں اللہ کے دیے ہوئے رزق کی۔''

''مجھے نہیں کھانے آلو۔'' احمد نے منہ بسورا اور بستر پر لیٹ کر بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ امی نے کھانا لا کر تپائی پر رکھ دیا کہ جب بھوک لگی، کھا لے گا۔

احمد نے ذرا دیر بعد آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا تو دیکھا امی جا چکی تھیں۔ تپائی پہ کھانا لگا ہوا تھا۔ ''ہونہہ...... آلو......'' وہ بڑبڑایا اور کروٹ بدلی۔ اب اس کے سامنے دیوار تھی۔ وہ غصے میں اسے گھورنے لگا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے دیوار دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، اب اس کے بیچ میں ایک عظیم الشان تخت نظر آ رہا تھا۔ اس پر ایک بہت بڑا آلو تاج پہنے براجمان تھا۔ آس پاس بہت سے آلو ہاتھ باندھے ادب سے کھڑے تھے۔

اچانک ایک آلو بولا۔ ''مقدمہ نمبر تین کے مدعی اور مدعی علیہ حاضر ہو جائیں۔''

احمد نے دیکھا کہ دائیں جانب سے ایک عجیب سی چیز نمودار ہوئی۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلا یہ بھی ایک آلو ہے، مگر اس کا حلیہ بہت خراب تھا۔ جگہ جگہ مٹی لگی ہوئی تھی۔

اتنے میں دو آلوؤں نے احمد کو دائیں بائیں سے پکڑ لیا۔ پھر کھینچتے ہوئے آلو بادشاہ کے عین سامنے کھڑا کر دیا۔

آلو بادشاہ نے احمد کو کوئی توجہ نہ دی بلکہ اس برے حلیے والے آلو کو مخاطب کیا۔ ''موٹی آلو! اپنا بیان پیش کرو۔''

اس آلو نے رونا شروع کر دیا۔ ''بادشاہ سلامت! یہ نہایت ظالم لڑکا ہے، اس نے مجھے سموسے سے نکال کر کیاری میں پھینک دیا تھا، جس کی وجہ سے میں موٹے موٹے کیڑوں کا شکار بن گیا، بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں، انہوں نے مجھے بری طرح نوچا ہے۔ اتنا کہہ کر وہ سسکیاں بھرنے لگا۔

سارے آلو احمد کو غصے سے گھورنے لگے۔ احمد گھبرا گیا۔ اتنے میں ایک اور آلو آیا۔ اس کی حالت بھی خراب تھی، وہ نہایت چپٹا تھا۔

''بادشاہ سلامت! گستاخی معافی، یہ واقعی سنگ دل اور بے حس لڑکا ہے۔ مجھے بھی اس نے پھینکا تھا، گراؤنڈ میں گرنے سے مجھے شدید چوٹ آئی اور پھر لڑکوں کے جوتوں نے میرا برا حشر کر دیا۔ میرے گول مٹول وجود کو چپٹا کر دیا...... ہائے بادشاہ سلامت، میرا موٹاپا کون لوٹائے گا مجھے؟'' اتنا کہہ کر وہ پچھاڑیں کھانے لگا۔ آس پاس کے آلو بھی غم زدہ ہو گئے۔ چند آلو چلائے۔ ''بادشاہ سلامت، یہ لڑکا مجرم ہے، اسے کڑی سزا دی جائے۔'' یہ سن کر باقی آلوؤں نے بھی شور مچا دیا۔ ''لڑکے کو سزا دی جائے، موٹی اور ٹونی کو انصاف دلایا جائے۔''

آلو بادشاہ نے ایک ہاتھ اٹھایا، سب آلو چپ ہو گئے۔ ''ابھی مدعی علیہ کا بیان باقی ہے۔ کیوں احمد میاں، تم ان کے دعوے کا کیا جواب رکھتے ہو؟'' احمد نے سر جھکا لیا۔ آلو سچ کہہ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر آلوؤں نے شور مچا دیا۔ ''سزا دی جائے، سزا دی جائے۔'' آلو بادشاہ نے تالی بجائی۔ احمد کو اپنے جسم پر کچھ رینگتا ہوا محسوس ہوا، اس نے دیکھا کہ رسی نما چیز اس سے لپٹتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اسے پورا جکڑ لیا۔ بلکہ یہ تو آلو کے چھلکے تھے جو اس سے رسی کی طرح چمٹ گئے تھے۔ احمد بے بس ہو کر چلانے لگا۔ ''رحم بادشاہ سلامت...... دوبارہ ایسا نہیں کروں گا۔''

اس سے پہلے کہ احمد گر پڑتا، ایک شور سنائی دیا، سب خاموش ہو گئے۔ یہ شور آلوؤں کا ایک گروہ مچا رہا تھا جو دوڑتے ہوئے ان کی جانب آ رہے تھے۔ آتے ہی سارے آلو احمد کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک آلو چلّایا۔ ''بادشاہ سلامت! گستاخی معاف، آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ احمد اچھا لڑکا ہے۔ یہ ہمارا محسن ہے۔''

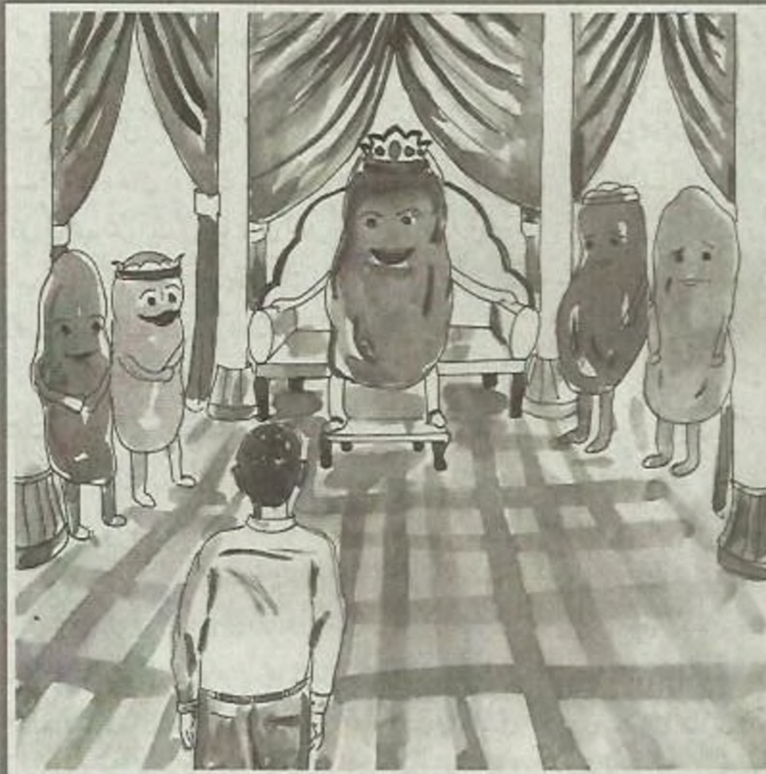
موٹی چلّایا۔ ''احمد برا لڑکا ہے بوبی بھائی، اس نے میرا اور ٹونی کا برا حال کر دیا ہے۔''

بوبی بولا۔ ''ارے نہیں تو، اس نے تو مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک ہونے سے بچایا۔ اگر یہ نہ آتا آج تو ہم گلی میں پڑے پڑے سڑ جاتے اور گندے کیڑوں کا شکار بن جاتے۔ اس نے ہمیں جمع کر لیا اور ہماری جان بچائی۔ ہم سب اس کے شکرگزار ہیں۔''

ٹونی بولا۔ ''نہیں بوبی، تم اس کی طرف داری نہ کرو، اسے ہم آلوؤں سے نفرت ہے، یہ ہمیں کھانا تک پسند نہیں کرتا، یہ ناشکرا ہے، ہماری ناقدری کرتا ہے۔'' بوبی کا ایک ساتھی بولا۔ ''دیکھو اگر آج ہم اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے تو پھر یہ بھی ہم سے محبت کرنے لگے گا، ہمیں شوق سے کھائے گا۔'' پھر وہ آلو بادشاہ سے مخاطب ہوا۔ ''بادشاہ سلامت، ہماری درخواست ہے کہ احمد کو معاف کیا جائے اور اسے رہا کیا جائے۔''

آلو بادشاہ کھنکارا، پھر بولا۔ ''میرا فیصلہ یہ ہے کہ بوبی اور اس کے ساتھی آٹھ ہیں جب کہ موٹی اور ٹونی دو ہیں، اس لیے بوبی کے ساتھیوں کا پلہ بھاری ہے، ان کی درخواست قبول کی جاتی ہے اور احمد کو اس وعدے کے ساتھ رہا کیا جاتا ہے کہ آئندہ وہ کسی آلو سے برا سلوک نہیں کرے گا۔''

یہ کہہ کر آلو بادشاہ نے تالی بجائی۔ ساری رسیاں غائب ہو گئیں۔



احمد کی جان میں جان آئی۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں بادشاہ سلامت......'' بوبی اور اس کے ساتھی خوشی سے اچھل رہے تھے۔ وہ سب احمد کے گرد گول گول گھومنے لگے۔ احمد بھی کھلکھلاتے ہوئے ان کے ساتھ گھومنے لگا، گھومنے لگا، گھومنے لگا، یہاں تک کہ اسے چکر آ گئے اور وہ گر پڑا۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ اپنے کمرے میں تھا۔ اس کے سامنے وہ دیوار تھی جسے وہ گھور رہا تھا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ ''اوہ...... تو یہ ایک خواب تھا۔''

اس نے آنکھیں رگڑیں۔ ''مجھ سے غلطی ہو گئی تھی، آلو تو بہت مزے دار ہوتے ہیں، میں کتنا بے وقوف تھا جو آلو نہیں کھاتا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ مزے سے آلو کھانے لگا۔ اس دن کے بعد سے آلو احمد کی پسندیدہ سبزی ہے۔

پیارے بچو! کیا آپ بھی ساری سبزیاں اور پھل کھاتے ہیں؟؟ اگر ہاں تو بہت خوب! اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری نہیں کرنی چاہیے، جو بھی ملے بسم اللہ پڑھ کر کھائیے اور صحت بنائیے۔

☆☆☆




گولڈی ننھی منی خوب صورت مچھلی تھی۔ اپنے دوستوں کے ساتھ پانیوں میں ادھر ادھر تیرتی پھرتی۔ خوشیاں مناتی لہریں جب ہوا کے ساتھ اپنی مخصوص آواز پیدا کرتیں تو یہ ان کے ساتھ مل کر گیت گنگناتی کبھی سطح آب پر آ کر ایسی چھلانگ لگاتی کہ دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ جاتے۔ "دیکھنا ساتھیو! جب میں بڑی ہو جاؤں گی تب میں ایک نئی دنیا تلاش کروں گی۔" ہمیشہ کہا کرتی اور جواب میں ساتھی مچھلیاں چلاّ چلاّ کر کہتیں خواہ مخواہ ہم بھی تمہارے ساتھ رہیں گی چاہے کہیں بھی جاؤ۔"

دتو مچھیرا ایک روز گھر سے ندی کنارے آیا۔ جال لگایا اور اپنی پھیری والی سائیکل پر سے ننھے منے شاپر نکال کر ہوا بھر کر پھلا پھلا کر دیکھنے لگا کہیں کوئی سوراخ تو نہیں ہے۔ سب کچھ اے ون تھا۔ دتو نے اپنے چھوٹے بیٹے اسلم سے کہا کہ گھنٹے بعد جال نکال لیجیو پھر جتنی مچھلیاں ہاتھ لگیں سمیٹ لیجیو۔ ہم تھوڑا آرام کر لیں۔ پھر روز کی طرح گلی گلی مچھلیاں بیچ کر روٹی کمانی ہے۔ دتو تو بڑے بڑے خراٹے لینے لگا۔ اسلم سر پر چھاتا جمائے ندی کنارے پاؤں ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں ڈبوئے مچھلیوں کا انتظار کرنے لگا۔ ابا جی تو گہری نیند سو گئے۔ کہیں ڈر کے مارے شکار ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ باپ رے باپ اتنے اونچے اور زور دار خراٹے۔ لگتا ہے ڈر کے مارے ندی کی مچھلیاں کہیں دور نہ نکل جائیں لیکن دتو مچھیرا تو غافل پڑا تھا۔ اس کا بڑا سا پیٹ کبھی اوپر اٹھتا کبھی نیچے کو چلا جاتا جیسے کوئی بھونپو ہو جو کبھی پھولے، کبھی پچکے۔

یکا یک بادل نمودار ہوئے کالی گھٹائیں چھا گئیں۔ اسلم نے زور لگا کر جال کھینچا تو قسمت ہی مانو کھل گئی۔ چھ سات سنہری مچھلیاں اور دس بارہ چاندی جیسی رنگت والی چمکتی دمکتی مچھلیاں جال میں پھنس چکی تھیں اور دوبارہ ندی کے پانی میں جانے کو مچل رہی تھیں لیکن اب کیا ہو سکتا تھا قید لکھی جا چکی تھی۔ تقدیر ماہی میں اسلم نے سنہری مچھلیاں کم کم ہی پکڑی تھیں۔ مچھلیوں کو جلد از جلد ندی سے کافی فاصلے پر بنے جوہڑ نما گڑھے میں منتقل کرنے کے بعد جب بادل کی گڑگڑاہٹ زور دار آواز سے گرجی تو بھاگم بھاگ ابا جی ابا جی چلاتا نیم کے بڑے پیڑ تلے سوئے باپ کے پاس آ پہنچا۔ ابا جی گہری نیند میں تھے۔ ان کی آنکھ نہ کھلی تو ڈرتے ڈرتے ہاتھ سے ہلایا جلایا۔ "ارے نامعقول ابھی تو ہم سوئے تھے کیا مصیبت آ گئی۔ مگر کالی گھٹائیں جو برسنے کو بے تاب ہوئی جا رہی تھیں دیکھ کر گھبرائے اور ندی کی طرف دوڑے۔ بوکھلاہٹ میں اپنے جوتے

بھی نیم کے پیڑ تلے چھوڑ دیے۔ پیچھے پیچھے اسلم۔ ''ابا جی سنیے تو مچھلیاں آپ کے کھودے بڑے گڑھے میں ڈال رکھی ہیں۔ واپس آیئے۔ دوڑتے قدموں کو یک دم بریک لگی۔ واپس پلٹے اور کہا پہلے بتلانا تھا۔'' کیا بتلاتا آپ سنیں تو! ابا جی خوش خبری ہے دس بارہ سرمئی مچھلیاں اور گن کر سات سنہری چمک دار پکڑی گئی ہیں۔ چلیے اب جلدی سے انہیں سنبھالیے۔ دونوں نے مل کر خوش خوش انہیں بڑے تسلے میں منتقل کیا۔ قریب ہی جھونپڑیوں میں ان کے عزیز واقارب بھی رہائش پذیر تھے۔ یہ بستی مچھیرا بستی کے نام سے مشہور تھی۔ وہاں جاتے جاتے بارش موسلا دھار شکل اختیار کر چکی تھی موسم چوں کہ گرمی کا تھا اس لیے بارش نعمت بن کر برس جا رہی تھی۔ جل تھل کا سماں تھا۔ پیاسی دھرتی جی بھر کر سیراب ہونے کو تھی۔ دتو مچھیرا بھی بہت راضی باضی تھا۔ کیوں کہ آج اس کی کمائی سنہری مچھلیوں سے زیادہ ہونے والی تھی۔ گھر پہنچ کر اس نے اپنی بیوی کو تمام ماجرا سنایا۔ بیوی بھی خوش ہوئی اور فرمائشیں کرنے لگی۔ گھر کا یہ والا سامان، وہ والا سامان ضرور شہر سے لے کر آنا۔ شام تک بادل اپنے گھر بسیرا کرنے چلے گئے۔ دوسری صبح جب سورج طلوع ہوا اس کی کرنیں پورے عالم کو منور کرنے لگیں۔ دن چڑھے دتو مچھیرا پھیری لگانے نکل کھڑا ہوا۔

مچھلی والا آیا ہے سنہری مچھلی لایا ہے
آ جاؤ بچو آ جاؤ مچھلی والا آیا ہے

ڈسکہ کے رہائشی بچوں نے جب یہ آواز سنی تو ان میں آمنہ حفیظ بھی شامل تھی۔ اپنی امی جان کے ساتھ صدر بازار سے گزر رہی تھی۔ آمنہ حفیظ جنون کی حد تک جانوروں، پرندوں سے پیار کرتی اور انہیں اپنا ساتھی بنا کر مسرت حاصل کرتی۔ امی جان وہ دیکھیے میری پسندیدہ ننھی منی مچھلیاں۔ امی جان نے جب ادھر نظر دوڑائی تو سائیکل والا نظر آیا جس نے سائیکل پر ایک ڈنڈے نما اسٹینڈ لگا رکھا تھا اور جگہ جگہ لکڑی میں کیل ٹھونک کر ننھی مچھلیوں سے بھرے شاپر لٹکائے ہوئے تھے۔ دتو مچھیرا یہی تو تھا جو آج سج دھج کر شہر چلا آیا تھا اپنی بیوی اور بچوں کی تمام فرمائش پوری کرنے کی خاطر!

قیمت پوچھی تو معلوم ہوا سنہری مچھلیوں کا جوڑا پانچ سو روپے کا ہے۔ امی جان تو ہکا بکا رہ گئیں۔ ''اتنا مہنگا بھائی چلو آمنہ بیٹی رہنے دو گھر بھی جانا ہے ابھی تو گروسری بھی مکمل نہیں ہوئی۔ مگر مجال ہے آمنہ حفیظ وہاں سے ہٹتی دتو مچھیرا جان گیا میری گاہک پکی کھری ہے۔ اس نے پھر سے آواز لگائی۔ وہی آواز جو بچوں کو مچھلیوں کی طرف کھینچ کھینچ کر لاتی اور وہ متوجہ ہوتے۔ تھوڑی دیر میں اس کے ارد گرد اور بھی بچے، بچیاں اپنے اپنے والدین کے ساتھ جمع ہونے لگے۔ آمنہ حفیظ مچل مچل گئی اور روتی آواز میں بولی کہ اگر یہ مچھلیاں بک گئیں تو میں کیا لوں گی؟ برائے مہربانی مجھے یہ لے دیں بالآخر مول تول کے بعد 400 روپے میں سودا طے پایا اور اپنی پسندیدہ مچھلیاں خریدنے کے بعد آمنہ حفیظ خوشی کے مارے کھل کھل گئی۔ مچھلی والے نے اسے تمام ہدایات فراہم کیں کہ کس وقت کتنی خوراک دینی ہے، پانی کب کب بدلنا ہے، صفائی ضروری رکھنی ہے، بلیوں سے کیسے بچانا ہے، صحن میں رکھنا ہے تو کوؤں سے بچانا ہے وغیرہ وغیرہ۔ گھر پہنچے تو اس کی چھوٹی بہنیں بھی مچھلیاں دیکھ کر باغ باغ ہو گئیں لیکن بڑی باجی خوش نہ ہوئیں کیوں کہ وہ پہلے والی پرانی مچھلیوں کا حال دیکھ چکی تھیں جو تڑپ تڑپ کر مریں اور کچھ کو بلی بیگم اپنے نرم و گداز پیڈ نما ہاتھوں سے نکال کر ہڑپ کر گئی تھی اور ایک دو بار تو لان میں گڑھے نکال کر جن مچھلیوں کو اپنی طرف سے ان چھوٹی بہنوں نے تالاب یا جھیل بنا کر دی تھی اور تیرنے کی آسائش بخشی تھی وہاں سے بھی ننھی منی مجبور مچھلیاں غائب ہونے پر کافی شور شرابا ہوا تھا کہ مچھلیاں کہاں گئیں، کون لے گیا، بلی کھا گئی یا پھر کوا ہاتھ صاف کر گیا؟ بہرحال آمنہ حفیظ نے ان دونوں کا نام بڑی گولڈی اور چھوٹی گولڈی رکھا۔ ایک پلاسٹک کا بڑا سا مرتبان بنایا گیا کیسے؟ بھئی گول مٹول بڑی سی بوتل کا اوپر والا حصہ کاٹ کر۔ کافی صفائی ستھرائی رکھی۔ خوراک وقت پر دی۔ وہ بھی مزے میں تھیں۔ آمنہ حفیظ ان کا بے حد خیال رکھتی، ان سے باتیں کرتی، وہ پانی کی اوپر والی سطح پر آیا کرتیں تو اچک اچک کر دانہ ننھا منا منہ کھول کر کھاتیں تو بے حد دل کش منظر دیکھنے کو ملتا۔

بڑی گولڈی اور چھوٹی گولڈی کو کچھ دن بعد اپنی ندی کی یاد نے بری طرح ستایا۔ موٹے موٹے آنسو نکلے تو غم سے دونوں سوکھنے لگیں اور اپنے باقی ساتھیوں کو سوچنے لگیں کہ کس طرح ہم آزاد تھیں۔ گھومنا پھرنا تیرنا، سطح آب پر آ کر فضا، ہوا، منظر دیکھنا، قدرت کے کھانے کھانا۔ اب کہاں وہ آزادی کی تمام نعمتیں۔ اگرچہ یہ لڑکی ہماری بہت حفاظت اور دیکھ بھال کر رہی ہے نجانے

باقی ساتھی کہاں کہاں ہیں کاش وہ وقت لوٹ سکتا ان کا ماضی انہیں تنگ کیے جا رہا تھا جب ان کے کانوں میں یہ آواز پڑی کہ ننھی سنہری پیاری مچھلیو! میری دوستو کیا بات ہے تم اداس کیوں ہو۔ میں بھی اداس ہوگئی ہوں کیا اپنا گھر یاد آ رہا ہے؟ کیا میں تم سے پیار نہیں کرتی، خیال نہیں رکھتی، کیا تمہیں خوش نہیں رکھتی تو دونوں جلد ہی ماضی کی خوش گوار یادوں سے حال میں لوٹ آئیں اور اپنی زبان میں کہا کہ کیوں نہیں اچھی لڑکی۔ تم بہت اچھی ہو۔ نجانے ہمیں کوئی اور لے جاتا تو ہمارا کیا حال کرتا۔ ابھی تک تو ہم زندہ ہیں۔ فکر نہ کرو مچھلیو میں ہوں نا۔ تو مچھلیاں دوبارہ مطمئن ہوگئیں۔



ادھر دتو مچھیرا پھیری لگا کر پانچ چھ ہزار لے کر گھر لوٹا تو خوشیوں سے مالا مال تھا اور اللہ تعالیٰ کا شکرگزار تھا جس نے روزی روٹی کا اچھا وسیلہ بنایا۔ دن یوں ہی گزرنے لگے۔ چھے ماہ کا طویل عرصہ گزر گیا۔ مچھلیاں جسامت میں بڑی ہوگئیں۔ ایک دن اچانک ایک مچھلی مردہ پائی گئی۔ وہ اپنی طبعی عمر پوری کر چکی تھی۔ آمنہ حفیظ بس ایک ہی گولڈی کے ساتھ رہنے لگی جو بڑی تھی۔ وہ اس کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھتی۔ چند دن کے لیے وہ اپنے عزیزوں کے گھر گئی تو پیچھے سے چھوٹی بہنوں نے گولڈی کا اس طرح خیال نہ رکھا جس طرح وہ رکھتی۔ پانی گدلا گدلا ہوگیا۔ مچھلی کی خوراک کی بجائے گھر کی خوراک بھی دینے لگیں۔ مچھلی بے بسی سے دیکھتی تو آنکھیں گندے غلیظ پانی میں ڈوب ڈوب جاتیں۔ وہ روتی آمنہ حفیظ کو یاد کرتی، آہیں بھرتی، سسکیاں لیتی مگر چھوٹی نادان بہنیں گیمز، ٹی وی میں گم رہتیں۔ سب کچھ جان کر انجان، کام چور اور سست بن جاتیں۔ رفتہ رفتہ گولڈی کا حسن دھندلا گیا۔ کچھ اپنی ساتھی مچھلی کے مر جانے کا غم، کچھ انسانی بے حسی، لاپرواہی۔ آخر ہفتہ کی صبح اپنی ساتھی کی طرح وہ بھی دارفانی سے کوچ کر گئی۔ گندا پانی، گندگی نے اس کی جان لینے کی ایسی وجہ بنائی کہ اسے دم دینا ہی پڑا۔ ندی سے گندگی تک کا سفر تمام ہوگیا۔ کاش ہم لوگ جان داروں کا اسی طرح خیال رکھنے کے قابل ہوں جس طرح اپنی ذات کا رکھتے ہیں۔ ان کے معاملے میں خودغرضی کی بجائے احساس ذمہ داری دکھائیں اور اپنی اہلیت کو سمجھیں جس کی بناء پر اشرف المخلوقات کا درجہ پایا۔ بے شک ہر جان دار کو ایک روز موت کا ذائقہ چکھنا ہے لیکن اس جان دار کی زندگی کو اذیت، تکلیف، گندگی، بے بسی کا شکار کر کے تو نہ مارا جائے۔ دعاؤں کی ہمیں ہر لمحہ ضرورت ہے وہ تو سمیٹی جائیں۔ آمنہ حفیظ کو بہ ذریعہ موبائل یہ خبر ملی تو اسے بھی سخت صدمہ پہنچا۔ وہ آج بھی اسے یاد کرتی ہے اور اس کی بے بسی والی موت پر آہیں بھرتی ہے اور گولڈی ندی کے سنہرے پانیوں کے خواب اوڑھے میٹھی نیند سو چکی ہے۔

☆☆☆




بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک چھوٹی سی بچی جس کا نام ماہ پارا تھا اپنی دادی اماں سے اکثر کوئی اچھی سی کہانی سنانے کی فرمائش کرتی تھی اور جب دادی اماں ماہ پارا کو کہانی سناتی تھیں تو وہ اسے دل چسپی سے سنتی تھی اکثر دادی اماں اور بچی شام ڈھلے ہی کھانا کھا لیتے تھے۔

ایک روز دادی اماں نے پان دان سے پان نکال کر بنایا اور اسے کھا کر چھالیہ کترنے لگیں۔ ماہ پارا نے دادی اماں سے پوچھا کہ وہ سارا دن پان کیوں کھاتی ہیں اور ہر وقت چھالیہ کیوں کترتی ہیں۔ دادی اماں بولیں۔ ”میری بچی ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے پان کھایا ہے اور اسے اپنے بڑوں کو بھی کھاتے دیکھا ہے۔“ ماہ پارا نے حیرت سے پوچھا۔ ”مگر دادی اماں یہ پان چھالیہ اگتے کہاں ہیں؟“ ”بچی پان تو اب ہر جگہ اگنے لگے ہیں۔ لیکن چھالیہ ابھی تک پردیس سے آتی ہے۔ انہوں نے جواب دیا۔ ماہ پارا نے پوچھا۔ ”کیا یہ دونوں چیزیں پیڑوں پر اگتی ہیں؟“ دادی اماں کو اپنی پوتی کے سوال کو سن کر ہنسی آ گئی۔ ضبط کرتے ہوئے انہوں نے جواب دیا۔ ”بھئی پان کی تو بیل ہوتی ہے۔ مگر چھالیہ کا درخت بڑا خوب صورت ہوتا ہے۔ کھجور کے درخت سے ملتا ہے لیکن اس کا تنا بہت پتلا اور نازک ہوتا ہے۔“ پھر انہوں نے کہا۔ ”اچھا اب زیادہ باتیں نہ بناؤ بہت رات ہو گئی ہے۔ تم سو جاؤ۔“ ماہ پارا نے کہا۔ ”نہیں! پہلے آپ کہانی سنایئے۔“ دادی اماں نے ذرا توقف سے کہا۔ ”اچھا آج میں تمہیں بولتے پان اور ہنستی چھالیہ کی کہانی سناؤں گی۔“ ”ہاں ضرور سنایئے۔“ ماہ پارا نے بے تاب ہو کر کہا۔ اب دادی اماں نے کہانی شروع کی۔

کئی برس ہوئے یہاں سے بہت دور ایک ملک کے بادشاہ کو نایاب اور عجیب و غریب چیزیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ ایک دن اس نے اپنے وزیر سے معلوم کیا۔ ”کیا کوئی شخص ایسا ہے جس کے پاس ہمارے باغ کے پودوں کے علاوہ بھی کوئی عجیب پودا ہے۔“ وزیر نے سوچ سمجھ کر بادشاہ کو جواب دیا۔ ”جہاں پناہ یہاں سے بہت دور برفیلی پہاڑوں کی چوٹیوں میں ایک دیو بادشاہ رہتا ہے اس کے پاس ایک نایاب پان کی بیل ہے اور بڑا اونچا چھالیہ کا درخت ہے۔ جب چودھویں تاریخ کو پورا چاند نکلتا ہے تو پان کی بیل بولتی ہے اور چھالیہ کا درخت ہنستا ہے۔“ بادشاہ وزیر کی بات سن کر حیران ہو گیا اور کہنے لگا۔ ”واقعی یہ تو آج ہم نے



پہلی بار سنا ہے۔'' وزیر نے کہا۔ ''آپ اپنے سردار مالی سے پوچھیے وہ بھی یہ بات جانتا ہے۔''

اتنے میں ماہ پارا کو نیند آ گئی اور اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک معمولی سے چھوٹے سے گھر میں سردار مالی ایک چارپائی پر سر پکڑے بیٹھا ہے اور مالی کی بیٹی اس کے پاس آ کر اس سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھتی ہے۔ مالی کہتا ہے۔ ''کیا بتاؤں بیلا بیٹی آج بادشاہ کا ایسا کڑا فرمان مجھے ملا ہے کہ میں سوچ سوچ کر پاگل ہو گیا ہوں۔'' بیلا نے ضد کر کے کہا۔ ''مجھے بھی بتاؤ بادشاہ نے ایسی کیا بات کہی ہے جس سے تم اداس ہو گئے ہو؟ مالی نے رنجیدہ ہو کر جواب دیا۔ ''بادشاہ سلامت کو معلوم ہوا ہے کہ پہاڑوں کے اس پار ایک دیو بادشاہ کے پاس بولتے پان کی بیل اور ہنستی چھالیہ کا درخت ہے۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ ایک مہینے کے اندر ان دونوں چیزوں کو یہاں لے آؤ۔ ورنہ میرا سر قلم کر دیا جائے گا۔ اب تو ہی بتا بیٹی مجھ بوڑھے میں اتنی ہمت کہاں ہے کہ ان دونوں پودوں کو یہاں وقت سے پہلے لے آؤں؟ ہاں اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ برف پوش پہاڑوں کو پار کر کے ان کو لے آتا اور میری جان بچ جاتی۔'' بیلا نے فوراً جواب دیا۔ ''ابا! میں کیا کسی بیٹے سے کم ہوں!'' اور پھر سوچ کر کہنے لگی۔ ''ابا میں بادشاہ کے لیے یہ پودے لاؤں گی۔'' بیلا کی یہ بات مالی کو پسند نہ آئی اس نے کہا۔ ''تو تو لڑکی ہے۔ یہ کام تیرے بس کا نہیں ہے۔ راستہ بے حد خطرناک ہے اور اس دیو کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے۔'' بیلا نے اپنے ابا کو تسلی دے کر کہا۔ ''یہ سب کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ بس مجھے ایک تلوار، ایک گھوڑا اور مردانہ لباس دے دو۔ پھر دیکھو میں کیا کرتی ہوں۔''

دوسرے روز بیلا مردانہ لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہو کر کمر سے تلوار باندھ کر برف پوش پہاڑوں کی چوٹی پر جا پہنچی۔ جہاں دیو بادشاہ شیر کے شکار پر نکلا ہوا تھا۔ وہ بھی شکاریوں میں شامل ہو گئی اور جوں ہی ایک شیر نے بادشاہ پر حملہ کیا کہ بیلا نے اپنی تلوار سے اس کا سر قلم کر ڈالا۔ یہ دیکھ کر دیو بادشاہ حیرت زدہ ہو گیا اس نے بیلا سے کہا۔ ''اے شخص ہم اس سے کچھ مطلب نہیں رکھتے کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔ تم نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ اور ہماری جان اس شیر کے منہ سے بچائی ہے۔ اس صلہ میں تم ہمارے تین روز تک شاہی مہمان ہو گے۔ تم وہاں آزاد پھرنا لیکن جہاں ہمارے نایاب بوٹے لگے ہوئے ہیں اگر ان کو چھوا یا انہیں چرانے کی کوشش کرو گے تو تمہارا سر جسم سے جدا کر دیا جائے گا۔'' بیلا نے اس حکم کو بہ خوشی قبول کر لیا۔ اور شاہی محل میں چلی گئی۔

رات کو جب پورا چاند نکلا تو بیلا چپکے چپکے باغ کے اس کونے کی طرف گئی جہاں بولتے پان اور ہنسی چھالیہ کے پودے لگے ہوئے تھے۔ بیلا نے سوچا کہ جھاڑی کے پیچھے چھپ کر سنوں کہ یہ پودے آپس میں کیا باتیں کرتے ہیں۔ پان نے کہا۔ ''سنو بی چھالیہ ہنسنا بند کرو اور میری بات غور سے سنو۔ آج دیو بادشاہ

کی جان ایک اجنبی لڑکے نے بچائی ہے۔ اور بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ وہ لڑکا نہیں وہ تو لڑکی ہے جو دور دیس سے آئی ہے۔ مگر یہاں کیوں آئی ہے نہیں معلوم۔'' یہ سن کر چھالیہ کو ہنسی آ گئی اور اس نے کہا۔ ''اس بات کا پتا کل چل جائے گا۔'' یہ باتیں سن کر بیلا حیران ہوئی۔ مگر اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی لیکن کسی



کے آنے کی آہٹ سے وہ جلدی سے محل کی طرف چلی گئی۔

دوسرے روز دیو بادشاہ نے اپنے وزیر سے پوچھا کہ یہ بات کیسے مان لی جائے کہ وہ بہادر شکاری مردانہ لباس میں لڑکی ہے۔ وزیر نے جواب دیا۔ ''حضور میں آپ کو تین تجاویز بتاتا ہوں۔ اس کو شک بھی نہ گزرے گا اور ہمیں ثبوت بھی مل جائے گا۔'' بادشاہ نے وزیر پر زور دیا کہ وہ اپنی تجاویز پیش کرے۔ ''بادشاہ سلامت اپنے دیوان خانے کے اس حصے کی طرف اس لڑکے کو لے جائیں جہاں ایک طرف ہتھیار لٹک رہے ہیں اور دوسرے حصے میں خوب صورت زیورات سجے ہوئے ہیں۔ وہ لڑکی عورت ذات ہوتے ہوئے ان زیورات میں دل چسپی لے گی اور غور سے انہیں دیکھے گی۔ اگر ایسا نہ کیا تو پھر اسے اپنے شیش محل میں لے جائیں جہاں ایک طرف دیوار پر قد آدم شیشے لگے ہوئے ہیں۔ اگر وہ لڑکی ہے تو اپنے بالوں کی لڑی کو ضرور کسی آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر سلجھائے گی۔'' دیو بادشاہ فوراً بولا۔ ''اگر یہ ترکیب بھی نہ چلی تو کیا کروں؟'' وزیر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''تو پھر حضور آپ اسے اپنے سات کھانا کھلائیے۔ جب کھانا کھا رہی ہو تو باورچی خانے سے دودھ کے جلنے کی بو آئے گی وہ ایک عورت ہونے کے ناطے باورچی خانے میں بھاگ کر آئے گی۔ اور پھر آپ پتا چلا لیں گے کہ اصل میں یہ لڑکا نہیں لڑکی ہے۔'' بادشاہ ان تجاویز کو سن کر بہت خوش ہوا۔ اور دوسرے روز بیلا کو شاہی محل کے دیوان خانے میں لے جانے کے لیے بلایا۔ جب بیلا نے دیوان خانے میں زیورات دیکھے تو دیو بادشاہ سے کہا۔ ''مجھے شوق ہے میں آپ کے محل میں ہتھیار دیکھنا ہی پسند کروں گا۔'' اس جواب سے بادشاہ ناخوش ہوا اور کہا۔ ''تم شیش محل میرے ساتھ چلو وہاں جا کر تمہارا دل بہلے گا۔'' جب بادشاہ کے ساتھ، بیلا شیش محل پہنچی تو اس نے کہا۔ ''بادشاہ سلامت اس خوب صورت محل سے مجھے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔'' بادشاہ کے پاس تیسری تجویز موجود تھی اس نے شام کے کھانے پر بیلا کو بلایا تو بیلا نے بڑی عاجزی سے کہلوایا۔ ''بادشاہ سلامت مجھ جیسے سپاہی کو کیوں کھانا کھلانا چاہتے ہیں۔ میں تو ان کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن میری سادہ زندگی میں یہ زیب نہیں دیتا کہ بادشاہ کے ساتھ ان کے شاہی دستر خوان پر بیٹھوں۔'' بادشاہ نے اس کا جواب کہلوایا۔ ''تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے جو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس لیے تم میری دعوت قبول کرو۔'' غرض کہ شام کی دعوت پر بیلا آئی تو بادشاہ نے کہا۔ ''اے سپاہی زادے تمہیں کیا دودھ کے جلنے کی بو نہیں آ رہی

ہے؟" بیلا نے بڑی حیرانی سے کہا۔ "حضور دودھ کی بو میں کیا جانوں؟ سپاہی تو اپنے دشمن کی بو پا کر چونکتا ہے۔"

اس رات پھر بھرپور چاندنی میں ایک عجیب سا ساز بج رہا تھا اور پان اور چھالیہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ پان سے چھالیہ نے پوچھا۔ "اے بی چھالیہ! کیا اس لڑکے کے یہاں آنے کا مقصد معلوم ہوگیا؟" چھالیہ ہنسی کو نہ روک سکی اور جلدی سے کہا۔ "پتا چل گیا، پتا چلا گیا۔" پان نے بڑی بے تابی سے بی چھالیہ سے پوچھا۔ "وہ کیا ہے؟ مجھے بھی بتاؤ۔" چھالیہ پھر ہنسی اور کہا میں نہیں بتاتی۔ میں نہیں بتاتی۔ تھوڑی دیر میں تم خود ہی دیکھ لوگے۔" اتنی دیر میں بیلا جھاڑی کے پیچھے سے نکلی اور دونوں پودوں کی جڑوں کو پھاوڑے سے کھودا۔ چھالیہ چلائی۔ "ارے ارے لڑکی یہ کیا کر رہی ہو؟" پان نے بی چھالیہ کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔ "تم ہمیں مت نکالو۔ اگر دیو بادشاہ کو معلوم ہوگیا تو تمہارا سر قلم کروا دے گا۔" چھالیہ زور سے ہنسی۔ "نہیں نہیں وہ سر قلم نہیں کرے گا۔" بیلا نے کام یابی اور پھرتی سے پودے نکال لیے اور اپنے گھوڑے کی طرف انہیں لے کر بھاگی۔ پان نے پوچھا۔ "او بی چھالیہ۔ یہ لڑکی ہمیں کہاں لے جا رہی ہے؟" چھالیہ نے جواب دیا۔ "ایک دوسرے دیس میں۔" بیلا بڑی تیزی سے گھوڑے پر سوار ہوئی اور ان پودوں کو اپنے ساتھ لے کر برف پوش پہاڑوں اور دریاؤں کو پار کر کے اپنے دیس میں جا پہنچی۔ جب بیلا سردار مالی کے پاس پہنچی تو اپنے ابا سے لپٹ کر کہا۔ "ابا دیکھو تو دونوں پودے تمہارے لیے لے آئی ہوں۔ یہ بتاؤ میرے آنے میں دیر تو نہیں لگی؟ جب بیلا کے ابا نے اسے دیکھا تو جوش کے مارے اس کے آنسو نکل آئے۔ اس نے بیلا کو پیار کر کے کہا۔ "نہیں نہیں تم وقت پر آ گئی ہو۔ میری مدت ختم ہونے میں ابھی چند گھنٹے باقی ہیں اور ہمیں ابھی بادشاہ کے محل جانا چاہیے۔"

باپ بیٹی بادشاہ کے محل پہنچے۔ انہوں نے دونوں پودے بادشاہ کے سامنے رکھ دیے۔ ان پودوں کو دیکھ کر بادشاہ بہت خوش ہوا اور مالی سے کہا۔ "لیکن ہمیں یقین کیسے آئے گا کہ یہ بولتے پان اور ہنستی چھالیہ کے پودے ہیں۔" مالی نے عاجزی سے کہا۔ "بادشاہ سلامت چاندنی رات ہونے دیجیے پھر آپ خود ہی ان کو باتیں کرتے سنیں گے۔"

دن کے وقت سردار مالی نے پودوں کو بڑی محنت سے باغ کے ایک محفوظ حصے میں لگا دیا۔ اور چاندنی رات کا انتظار کرنے لگا۔ جب چاندنی رات ہوئی تو مالی نے بادشاہ کو اپنے ساتھ لا کر پان اور چھالیہ کی باتیں سنوائیں۔ بادشاہ نے پہلے پان کی بات سنی وہ کہہ رہا تھا۔ "لڑکی نے تو بڑی ہمت کی۔ وہ دیو بادشاہ کے باغ سے ہمیں نکال کر یہاں لے آئی۔" چھالیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھیا اب دیکھنا کیا ہوتا ہے۔" بادشاہ ان کی باتیں سمجھ رہا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ مالی کی لڑکی بڑی کام یابی سے یہ پودے لے کر آئی ہے تو اس نے مالی سے کہا۔ "ہم تمہیں بہت سا انعام دیں گے اور تمہاری لڑکی کے لیے ایک محل بنوا دیں گے اور اسے سونے چاندی اور اشرفیاں بھی دیں گے۔ اس لڑکی نے ہماری عزت بھی رکھی اور ہمارا جی بھی خوش کیا۔" پان نے چھالیہ سے کہا۔ "بی چھالیہ اب ہمارا کیا حال ہوگا؟" چھالیہ نے بے ساختہ ہنسی کے انداز میں کہا۔ "یہاں بھی ہم تم یوں ہی ہنستے اور بولتے رہیں گے۔"

☆☆☆

## اپنی اصلیت کو نہ بھولو

کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایک عقاب رہتا تھا۔ پہاڑ کے نیچے، درخت پر ایک کوے کا گھونسلا تھا۔ ایک دن کوے نے عقاب کو پہاڑ سے اڑ کر نیچے آتے دیکھا۔ عقاب نیچے اتر کر ایک بھیڑ کے بچے پر جھپٹا اور اسے پنجوں میں دبا کر اڑ گیا۔

کوا یہ دیکھ کر دل میں کہنے لگا۔ "مجھے بھی اسی طرح شکار کرنا چاہیے۔" یہ سوچ کر وہ ایک بھیڑ کے بچے کی پیٹھ پر آ بیٹھا اور اپنے پنجے اس کی اون میں جما دیے۔ اس نے بہت زور لگایا مگر بھیڑ کے بچے کو لے کر اڑ نہ سکا۔

جب اس نے دیکھا کہ کوشش بے کار ہے تو اڑ کر بھاگ جانا چاہا۔ مگر اس کے پنجے بھیڑ کے بچے کی اون میں پھنس گئے تھے۔ وہ کسی طرح نہ چھوٹے۔

اب تو کوا بہت گھبرایا اور پھڑپھڑانے لگا۔ اتنے میں گڈریا آ گیا اور اس نے کوے کو پکڑ لیا۔ شام کو گڈریا گھر لوٹا تو بچوں کے کھیلنے کے لیے کوے کو بھی ساتھ لیتا گیا۔

اس نے بچوں سے کہا۔ "اس کوے کا خیال تھا کہ میں عقاب ہوں، مگر آج اس کو معلوم ہوگیا کہ میں اصل میں کوا ہوں۔"

کسی نے سچ کہا ہے کہ اپنی اصلیت کو نہ پہچاننا اور دوسروں کی نقل کرنا آدمی کو خراب کرتا ہے۔




## چند آنسو

تفسیر حیدر، سرگودھا

اسکول کا گراؤنڈ مکمل دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ گراؤنڈ میں مختلف کلاسز کے بے شمار طلباء منہ لٹکائے قطار میں کھڑے تھے۔ چند اساتذہ چھڑی ہاتھ میں پکڑے قطارے کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ یہ سرکاری اسکول ایک پسماندہ علاقے میں واقع تھا۔ جہاں ابھی تک چھڑی کا نظام رائج تھا۔ ''آپ سب اسکول یونی فارم والے جوتے اور جرسیاں کیوں نہیں پہن کر آتے؟ اسکول کو پارک سمجھ رکھا ہے کہ جو جی میں آیا پہن کر چلا آیا۔'' اشفاق صاحب نے تمام طلباء کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ تمام طلباء سر جھکائے خاموشی سے ڈانٹ سنتے رہے۔ پھر وہی ہوا جو روز ہوتا تھا یعنی سب کو سزا دی گئی۔

''بیٹا! آپ لوگوں کو روزانہ سزا ملتی ہے پھر بھی بات نہیں مانتے...... کیوں؟'' سر احسن نے حاضری لگانے کے بعد اپنی کلاس کے بچوں سے پوچھا۔ ''سر......! وہ...... ابو نے کہا ہے کہ ٹھیکیدار پیسے دے گا پھر جرسی اور جوتے لے دیں گے۔'' عمیر کی آنکھوں سے چند آنسو گر کر اس کے دامن میں جذب ہو گئے۔ سر احسن نے تمام طلباء کی طرف دیکھا، انہیں سب کی آنکھوں میں اسی طرح کے جواب نظر آئے۔

''میں آپ سب سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' سر احسن نے تفریح کے وقت اسٹاف روم میں موجود اساتذہ سے کہا۔ ''جی...... جی فرمائیں......!'' امجد صاحب نے اخبار سے نظریں ہٹاتے ہوئے احسن صاحب کی طرف دیکھا۔ سر احسن نے بات شروع کی۔ ''جناب! میں کہنا چاہ رہا تھا کہ اس طرح روزانہ بچوں کو سزا دینا مناسب نہیں ہے۔ میں نے تمام کلاسز کے طلباء سے پوچھا ہے تو مجھے علم ہوا کہ تقریباً سارے طلباء غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں چوں کہ یہ گاؤں بھی کافی پسماندہ ہے اس لیے زیادہ تر لوگ بھٹوں پر کام کرتے ہیں یا چند دوسرے چھوٹے موٹے پیشوں سے وابستہ ہیں۔ ان کے گھر والے اچانک اتنا خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔'' ''لیکن احسن صاحب ہم کیا کر سکتے ہیں اسکول کے بھی کچھ قوانین ہیں۔'' اشفاق صاحب نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اگر ہم سب اس ماہ کی آدھی آدھی تنخواہ جمع کر کے ان غریب بچوں کو جرسیاں اور جوتے وغیرہ لے دیں تو کیسا رہے گا؟'' احسن صاحب نے سوالیہ نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔ ''نہیں...... نہیں...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمارے اپنے بھی سو طرح کے اخراجات ہیں ہم یہ خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔'' اصغر صاحب نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ باقی تمام اساتذہ نے بھی ان کی تائید کی۔ سر احسن نے پرنسپل صاحب سے بھی بات کی لیکن بے سود۔ آخر کار انہیں خود ہی ایک فیصلہ کرنا پڑا۔

دو دن بعد سر احسن نے اسکول کے تمام غریب طلباء میں جوتے، مفلر، دستانے اور جرسیاں وغیرہ تقسیم کیں۔ چوں کہ طلباء کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لیے تمام اساتذہ حیران تھے کہ آخر ان کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے۔ سر احسن گراؤنڈ میں کھڑے ہو کر بچوں کے چہرے پر خوشی دیکھ رہے تھے وہ سب خوشی سے اچھل رہے تھے۔ بچوں کو اچھلتا دیکھ کر انہیں کچھ یاد آیا اور چند آنسو ان کی آنکھوں سے گر کر مٹی میں جذب ہو گئے۔

تفریح کے وقت سر احسن سے امجد صاحب نے پوچھ ہی لیا۔ ''احسن صاحب آپ نے اتنی رقم کا انتظام کہاں سے کیا؟'' سر احسن نے کچھ سوچتے ہوئے بتا ہی دیا۔ ''کاشف کے علاج کے لیے میں جو پیسے جمع کر رہا تھا وہی پیسے تھے۔'' ''کیا......؟ لیکن کاشف کا کیا ہو گا آپ چھ ماہ سے اس کے لیے پیسے جمع کر رہے تھے۔'' امجد صاحب کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''اللہ خیر کرے گا۔'' سر احسن نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ کاشف ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ایک دن اسکول سے واپسی پر ایک حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ سر پر شدید چوٹوں کی وجہ سے وہ کوما میں چلا گیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ احسن صاحب اس کے علاج کے لیے پیسے جمع کر رہے تھے اس لیے سب حیران تھے۔ ''صاحب......! صاحب......! آپ کے گھر سے فون آیا ہے۔''

چپڑاسی نے احسن صاحب کے ہاتھ میں فون پکڑایا۔ احسن صاحب فون سن کر کرسی سے اچھل پڑے خوشی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''کیا ہوا......؟'' امجد صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ ''میری بیوی کا فون تھا...... کاشف کو ہوش آ گیا ہے...... وہ بات بھی کر سکتا ہے۔'' سر احسن کا خوشی سے برا حال تھا۔ سب حیرت زدہ تھے کہ اچانک کاشف کیسے ٹھیک ہو گیا۔ سب سر جھکائے سوچ رہے تھے کہ یہ اسی نیکی کا نتیجہ ہے جس سے وہ سب اپنی خودغرضی کی وجہ سے محروم رہ گئے تھے۔ سر احسن سر سجدے میں رکھے اپنے رب کا شکر ادا کر رہے تھے۔

پہلا انعام: 195 روپے کی کتب

## خود میاں فضیحت......!

سلمان یوسف سمیجہ، علی پور

ان سے ملیے! یہ ہیں ایک عظیم رائیٹر! نام ہے الیاس صاحب! الیاس صاحب اپنی اچھی کہانیوں کی وجہ سے بڑوں اور چھوٹوں میں بہت ہی مقبول ہیں۔ ان کی مزے دار کہانیاں رسائل میں چھپتی ہیں، ان کی کہانیوں میں اخلاقیات، دینیات، زندگی جینے کا ڈھنگ جیسے اسباق ملتے ہیں لیکن ان میں ایک خامی ہے، وہ یہ کہ یہ اپنی کہانیوں میں تو سبق دیتے ہیں لیکن خود ان پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ کل ہی کی بات ہے یہ صاحب ایک صاحب سے بغیر کوئی وجہ کے جھگڑ پڑے۔ حالاں کہ ایک مشہور رسالے کے تازے شمارے میں ان کی کہانی شائع ہوئی جس میں انہوں نے لڑائی جھگڑے کے نقصانات وغیرہ بیان کیے تھے اور لڑائیوں سے بچنے کا سبق بھی دیا تھا لیکن خود اس درس پر رتی برابر بھی عمل نہ کیا۔ اب ان سے ملاقات کیجیے، یہ ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب ہیں جو طلباء کو ایک دوسرے کو گالیاں نہ دینے، غصے نہ کرنے وغیرہ کا درس دیتے ہیں لیکن یہ بھی رائیٹر الیاس صاحب کی طرح ٹھہرے! کل ایک طالب علم نے دوسرے طالب علم کو گالی دی تو جواب میں دوسرے نے بھی پہلے والے کو گالی دے دی۔ جب ہیڈ ماسٹر صاحب نے یہ سنا تو غصے سے دہاڑے۔ ''نالائقو! گدھو، بدتمیزو، تم لوگوں کو اور کتنی بار سمجھاؤں کہ گالی دینا گناہ کبیرہ ہے۔''

آپ لوگوں نے دیکھا! ہیڈ ماسٹر جو دوسروں کو بڑے بڑے درس دیتے ہیں وہ خود اس پر عمل نہیں کرتے، انہوں نے طالب علموں کی اس حرکت پر غصہ کیا، ''گدھو، بدتمیزو'' وغیرہ جیسے القابات سے بھی نوازا اور گالیاں دے کر انہیں گالیوں سے باز رہنے کا بھی کہا۔ اب ذرا ان سے بھی ملاقات ہو جائے! یہ ہیں ہمارے معزز شیخ صاحب! بڑے ہی نامی گرامی انسان ہیں۔ جہاں بھر میں ان کی عزت ہے۔ ان کی شہرت کا راز یہ ہے کہ یہ بڑی بڑی تقریریں فرماتے ہیں۔ سیمنارز، مجالس وغیرہ میں ایسی پرجوش تقریریں کرتے ہیں کہ ان کے منہ سے جوش کے مارے جھاگ نکلنا شروع ہو جاتا ہے اور سننے والا بڑے انہماک سے ان کی ''پرجوش تقاریر'' سنتا ہے۔ مجھے ان کی ایک تقریر یاد ہے جو انہوں نے محلے کے لوگوں سے کی تھی۔ جو کچھ یوں تھی۔ ''پانی ہمارے لیے بہت بڑی نعمت ہے، پانی نہ ہوتا تو ہم نہ ہوتے، یہ جہاں نہ ہوتا، دنیا کی خوب صورتی نہ ہوتی اور نجانے کیا کیا چیز نہ ہوتی۔ ہمیں پانی کی قدر کرنی چاہیے، اسے ضائع کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔'' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن دوسرے ہی دن جب میں اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلا اور شیخ صاحب کے گھر کے قریب سے گزرا تو یہ دیکھ کر میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا کہ شیخ صاحب کے گھر کے گیٹ کے نیچے والے راستے سے پانی بڑی روانی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ شیخ صاحب ہمیں تو پانی بچانے کی نصیحتیں کرتے ہیں مگر یہ اور ان کا گھرانہ عمل نہیں کرتے۔ اب میں آپ کو ایک اور ''نمونے'' سے ملواتا ہوں۔ نام ہے تاج دین، مگر تاجو کے نام سے مشہور ہیں، شادی نہیں کی، شاید شادی شدہ مردوں کی ''پتلی حالت'' دیکھ کر انہوں نے ''عبرت'' پکڑی اور شاید خود سے وعدہ کیا کہ کبھی بھی جیتے جاگتے ''جہنم'' میں نہ جاؤں گا۔ ان سے کئی چھوٹے بھائیوں کی لائنیں لگی ہوئی ہیں جو محنت کر کے گزارہ کرتے ہیں۔ مگر یہ تاجو جی محنت مزدوری نہیں کرتے۔ چھوٹے بھائیوں کو سبق دیتے ہیں کہ ''ہمیشہ کام کرنا، محنت سے ہی تم لوگوں کے بخت جاگیں گے۔'' یہ جملہ ان کی زندگی کا تکیۂ کلام بن چکا ہے۔ یہ بھائیوں کو محنت کرنے کا تو کہتے ہیں مگر خود جناب ہر وقت چارپائیاں توڑتے رہتے ہیں۔ آپ ہر روز انہی طرح کے کرداروں سے ملتے ہوں گے۔ یہ حضرات خود تو دوسروں کو سمجھاتے ہیں مگر خود اپنے دماغ میں یہ باتیں نہیں بٹھاتے۔ یعنی کہ ''خود میاں فضیحت، دیگراں را نصیحت۔'' ان لوگوں کو چاہیے کہ وہ جو دوسروں کو سدھارنے کی کوشش کرتے ہیں خود بھی سدھریں، عمل کریں، اچھا انسان بنیں۔ اقبال کہہ گئے ہیں کہ:

"عمل سے زندگی بنتی ہے ، جنت بھی ، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے"

دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب

## نماز کی برکتیں

شکیبہ جمیل احمد، حافظ آباد

"فضل علی آج پھر تم لیٹ ہو گئے ہو۔ اگر تم اسی طرح لیٹ ہوتے رہے تو تمہیں ملازمت سے نکال دیا جائے گا۔" فضل علی کے دوست نوازش نے اُسے تھوڑا سا ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "نہیں دوست وعدہ کرتا ہوں آج کے بعد کبھی لیٹ نہیں ہوں گا۔" فضل علی کام شروع کرتے ہوئے بولا۔ "وعدے تو تم ہر روز کرتے ہو اب تو مجھے تمہارے وعدوں پر بھی یقین نہیں رہا۔" نوازش نے برا سا منہ بنا کر کہا اور ادھر سے چلا گیا۔ فضل علی کی آنکھیں بھر آئیں اور اسے گزرا ہوا وقت یاد آنے لگا۔ جب ابا سب کو صبح صبح اٹھاتے تھے۔ سب فوراً اٹھ جاتے اللہ کا نام لیتے پھر سب مل کر ناشتا کرتے اور اپنے اپنے کاموں کو چلے جاتے۔ شام کو جب سب کاموں سے واپس آتے مل کر سب تھوڑی دیر باتیں کرتے اور پھر سو جاتے۔ زندگی اسی طرح بہت خوب صورتی سے گزر رہی تھی۔ پھر ابا کی وفات سے سب کو ایک زوردار دھچکا لگا۔ فضل علی اماں ابا کا پانچ بیٹوں میں سے سب سے چھوٹا ہونے کے ناطے بہت بہت پیارا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ ابا کی وفات کے کچھ مہینوں بعد ہی سب بھائیوں میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ اب نہ تو ابا تھے جو آپس میں صلح کرا دیتے اماں کی کوئی سنتا نہ تھا۔ جھگڑا زیادہ بڑھا تو سب بھائی الگ الگ ہو گئے۔ فضل علی اور اماں اب دونوں رہ گئے تھے جو حویلی میں ہی رہنے لگے۔ ادھر سے ہی فضل علی کی بیزارگی، سستی کا آغاز ہوا تھا۔ یادوں کو تو فیکٹری میں موجود گھنٹی نے توڑا جو ہر روز دوپہر کے کھانے کے لیے بجتی تھی۔ فضل نے بھی اماں کی بنائی ہوئی اچار، روٹی کھائی۔ شام کو جب فضل گھر واپس آیا تو اس کا چچا جو فیصل آباد سے کافی دیر بعد آئے تھے۔ فضل ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ حال چال پوچھنے کے بعد جب چچا نے بھائیوں کے بارے میں پوچھا تو فضل علی کی بیتی ہوئی تمام روداد سنا دی۔ اب تو چچا جان کام میں بھی دل نہیں لگتا۔ ہر روز لیٹ ہو جاتا ہوں۔ فیکٹری کا مالک بھی مجھے کام سے فارغ کرنے والا ہے۔ فضل علی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "صبر کرو بیٹا اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ تم اپنے گھر کی تمام خوشیاں واپس لا سکتے ہو۔ وہ کیسے چچا جان؟ فضل علی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اللہ کی یاد سے۔ اللہ کے ذکر سے تم اپنے گھر کی تمام خوشیاں واپس لا سکتے ہو۔ نماز جو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، دل کا سکون اور مومن کی معراج ہے۔ اللہ انسانوں کا خالق مالک اور رازق ہے۔ اسی کی عبادت کی جائے اور اسی کی بڑائی اور پاکیزگی بیان کی جائے۔ نماز اللہ سے مخاطب ہونے، دعا مانگنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کا بے مثال ذریعہ ہے۔ اللہ نے آپ کو اپنی عبادت اور اطاعت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بار بار نماز قائم کرنے کا حکم دیا اور اسے مومنین کی خاص صفت قرار دیا۔

کیوں بھائی فضل علی جب آپ اللہ کی استطاعت اور عبادت کریں گے تو اللہ آپ پر کتنا مہربان ہو گا یہ آپ کو اندازہ بھی نہیں ہے۔ ہاں تو آئی بات کچھ سمجھ میں۔" چچا نے پیار سے کہا۔ فضل علی نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔

کچھ دنوں بعد چچا تو واپس چلے گئے اور ساتھ ہی فضل علی کی زندگی بھی بدل گئی۔ اللہ نے فضل علی کو الگ کاروبار بھی دیا اور سب بھائیوں کی آپس میں صلح بھی ہو گئی۔ یہ گھرانہ دوبارہ سے خوش گوار زندگی گزارنے لگا۔ "دوستو! یہ ہیں نماز کی برکتیں۔"

تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب

## بداخلاقی کا انجام

محمد طاہر کلیم، چکوال

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک گاؤں میں دو بہنیں اپنی دادی اماں کے ساتھ رہتی تھیں۔ بڑی بہن کا نام عتیقہ تھا جب کہ چھوٹی بہن کا نام سعدیہ تھا۔

عتیقہ انتہائی شریف اور بااخلاق لڑکی تھی لیکن اس کی چھوٹی بہن سعدیہ انتہائی بداخلاق اور بدتمیز لڑکی تھی۔ اس کی عادات میں کسی کو تنگ کرنا، کسی کے بارے میں برے خیالات کرنا، چغلی کھانا اور زبان پر ہر وقت گالیوں کا ورد جاری رکھنا شامل تھا۔

ایک دفعہ اتوار کے دن عتیقہ نے جنگل میں سیر کا پروگرام بنایا۔ وہ سارا دن جنگل میں گھومتی رہی حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا۔ وہ جنگل میں ڈرتے ہوئے آگے بڑھنے لگی کہ اچانک اسے ایک جھونپڑی نظر آئی۔ وہ ہمت کر کے آگے بڑھی تو دیکھا کہ وہاں پر ایک بڑھیا بیٹھ کر روٹیاں پکا رہی تھی۔ عتیقہ نے بڑھیا سے رات بسر

کرنے کی اجازت مانگی تو اس نے فوراً اجازت دے دی۔ عتیقہ نے روٹیاں پکانے میں اس کی مدد کی۔ صبح سویرے اٹھ کر بھی اس کا ناشتا تیار کیا اور اس کے دوسرے کام بھی کیے۔ جب وہ جانے لگی تو بڑھیا نے اسے ایک تحفہ دیا۔ وہ خوشی خوشی گھر پہنچ گئی۔ سعدیہ نے جب اس کا تحفہ دیکھا تو اس سے تحفے کے بارے میں پوچھا۔ عتیقہ نے سچ سچ بتا دیا۔ اس نے بھی جنگل میں جانے کا پروگرام بنا لیا۔

اتوار کے دن وہ شام کو عتیقہ کے بتائے گئے پتے پر پہنچ گئی اور ایک درخت کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی اور رات ہو جانے کا انتظار کرنے لگی۔ جب رات چھا گئی تو وہ بڑھیا کے پاس گئی اور سارا ماجرہ بتا کر اس سے رات گزارنے کی اجازت مانگی۔ بڑھیا نے اجازت دی تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمائی کہ اب تو وہ بھی تحفہ لے کر جائے گی۔ مگر...... اس نے بڑھیا کی کوئی خدمت نہیں کی بلکہ اپنی عادت کے مطابق اسے تنگ بھی کیا۔ صبح جب وہ جانے لگی تو بڑھیا نے اسے بھی تحفہ دیا۔ وہ خوشی اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ گھر روانہ ہو گئی۔

اس نے عتیقہ کو بلایا اور اس کے سامنے تحفہ کھولنے لگی۔ جب ڈبہ کھولا تو یہ کیا؟...... ارے اس میں تو سانپ، بچھو اور پتھر تھے۔ اب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اسے اپنی بداخلاقی کا انجام ملا تھا اور اس کی بڑی بہن عتیقہ کو اپنے اخلاق کا صلہ ملا تھا۔ میرے پیارے بہن بھائیو! تم بھی اپنے اخلاق کو بہتر بنا لو۔

چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب

## سبق

سیدہ معصومہ زینب نقوی، اسلام آباد

ذیشان، ایوب اور ماجد یوں تو بہت ذہین بچے تھے مگر تھے بہت شرارتی۔ اپنی شیطانیوں کی وجہ سے وہ پورے محلے میں مشہور تھے پڑوس کے تمام لوگوں کی ناک میں تینوں نے دم کر رکھا تھا۔ دوسروں کو پریشان کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ والدین نے انہیں کئی مرتبہ سمجھایا کہ دوسروں کو تنگ کرنا اچھی بات نہیں مگر تینوں کے کان پر جوں نہ رینگتی۔ آج بھی تینوں بھائی اپنا ہوم ورک مکمل کر کے حسب معمول شام کے وقت پارک میں بیٹھ کر سوچ رہے تھے کہ آج کیا شرارت کی جائے کہ اچانک ماجد ایک لڑکے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”ذیشان وہ دیکھو یہ تو وہی لڑکا ہے جس نے ابو سے ہماری شکایت کی تھی۔“ ”ارے ہاں یار یہ تو وہی ہے جس کی وجہ سے ابو نے ہمیں ڈانٹا تھا۔“ ”آؤ چل کے دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے۔“ ذیشان بولا۔ پارک میں درختوں کی لمبی قطار تھی۔ وہ اس کے پیچھے چل پڑے۔ لڑکا جو اپنی سائیکل پر بیٹھا ہوا تھا پارک میں داخل ہوتے ہی اس پر سے اترا اور سائیکل سے اپنی کتابیں اٹھانے لگا اور پھر اپنی سائیکل کو تالا لگا کر کچھ فاصلے پر ایک بینچ پر جا بیٹھا۔

”ذرا چپ کر کے میری بات سنو۔“ ذیشان نے کہا اور پھر منصوبہ بتانے لگا۔ راستے میں امام صاحب نے لڑکے سے پوچھا کہ اس کی سائیکل کے ٹائر سے کس نے ہوا نکالی ہے تو لڑکے نے جواب دیا۔ ”میرا دوست بتا رہا تھا کہ تین لڑکے میری سائیکل کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ تین لڑکوں کا نام سنتے ہی امام صاحب سمجھ گئے کہ یہ کام کس کا ہو سکتا ہے۔ پھر لڑکے کو اس کے گھر اتار کر وہ واپس مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔

تینوں بھائی عصر کی اذان ہوتے ہی نماز پڑھنے کے لیے پارک سے مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ نماز پڑھ کر وہ گھر کے لیے نکل ہی رہے تھے کہ امام صاحب نے انہیں روک لیا۔ صفائی کر کے مسجد میں بیٹھ کر امام صاحب کا انتظار کرنے لگے تاکہ وہ گھر جا سکیں۔ کافی وقت گزر جانے کے باوجود بھی جب امام صاحب واپس نہ آئے تو وہ تینوں بہت پریشان ہو گئے کہ ہم اب گھر کیسے جائیں گے۔ اچانک انہیں امام صاحب نظر آئے۔ وہ تینوں بھاگ کر ان کی جانب گئے۔ امام صاحب انہیں پیار کرتے ہوئے شفقت سے بولے۔ ”بیٹا آپ تینوں میرے تھوڑی سی دیر سے آنے کی وجہ سے اتنے پریشان ہو گئے تھے۔ آپ نے ایک بار بھی سوچا ہے کہ وہ لڑکا جس کی سائیکل کے ٹائر سے آج آپ نے ہوا نکالی ہے وہ کیسے گھر پہنچا ہو گا؟ وہ کتنا پریشان ہوا ہو گا اور اس کے والدین اس کے لیے کتنا پریشان ہوئے ہوں گے؟ بیٹا انسان جو کرتا ہے آخر میں اسے اسی کا صلہ ملتا ہے کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ہمارے پیارے نبیؐ نے دوسروں کو پریشان اور تکلیف پہنچانے سے سختی سے منع فرمایا ہے اور مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا فرض ہے کہ ہم آپؐ کے حکم پر عمل کریں۔“ امام صاحب نے اپنی بات مکمل کر کے ان تینوں کی جانب دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ندامت تھی۔ ان تینوں نے عہد کیا کہ وہ اب کسی کو تنگ نہیں کریں گے۔

پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب

قسط 11

احمد عدنان طارق

# ویران جزیرے کا راز

(گزشتہ سے پیوستہ) اسے یقین تھا کہ ہم نے یہ مچھلی کھلے سمندر سے پکڑی ہے۔ پرویز صاحب نے فوراً پوچھا۔ ''کیا تم نے اسے بتا تو نہیں دیا؟''

تزئین نے انکار میں سر کو ہلایا اور کہنے لگی۔ ''کبھی نہیں، اسے معلوم ہو گیا کہ ہم آپ کی کشتی میں سیر کرتے ہیں تو وہ ہماری یہ خوشی بھی ہم سے چھین لے گا۔'' پرویز صاحب پوچھنے لگے۔ ''کیا تمہارے چچا اور چچی کو میرے بارے میں علم ہے؟'' تزئین نے پھر انکار میں سر کو ہلایا اور پوچھا۔ ''ان کو بتانے سے کیا فرق پڑتا ہے لیکن آپ چاہتے ہیں کہ انہیں معلوم ہو؟'' پرویز صاحب ماتھے کے اوپر گنجے سر کو کھجاتے ہوئے بولے۔ ''میں دراصل یہاں اکیلے رہنے آیا تھا تاکہ پرندوں کے متعلق جان سکوں اور میں نہیں چاہتا کہ میرا میل ملاپ بڑھے اور لوگ میری چھٹیاں خراب کر دیں لیکن آپ کی بات اور ہے بچو، مجھے آپ اچھے لگتے ہو۔'' پرویز صاحب اس خستہ حال جھونپڑی میں اکیلے رہتے تھے حالاں کہ ان کے پاس ایک نئی آرام دہ کار تھی جسے وہ ایک چٹان کی گگر کے نیچے کھڑا رکھتے تھے اور کار کے اوپر کپڑا ڈالا ہوتا تھا۔ وہ جب چاہتے اپنی کار میں بیٹھ کر نزدیکی قصبے میں خرید و فروخت کے لیے جایا کرتے تھے۔ انہوں نے سونے کے لیے گدا اور دوسری چیزیں لا کر جھونپڑی میں رکھی تھی تاکہ اپنے رہنے کو پُرسکون بنا سکیں۔ بچے بھی خوشی سے پاگل ہو رہے تھے، ان کے استعمال میں اب کشتی بھی تھی اور ایک کار بھی۔ انہوں نے پرویز صاحب کو درخواست کی کہ وہ اگلی دفعہ انہیں بھی نزدیکی قصبے میں لے جائیں۔ عتیق کہنے لگا۔ ''میں نے ایک ٹارچ خریدنی ہے۔ پرویز صاحب! آپ کو یاد ہے کہ ہم نے آپ کو خفیہ راستے کے بارے میں بتایا تھا اس راستے پر ایک ہاتھ میں موم بتی لے کر چلنا بہت مشکل ہے وہاں جانے کے لیے ٹارچ کی ضرورت ہے۔ اگر آپ مجھے اپنی کار میں ساتھ لے جائیں گے تو میں وہاں سے ایک ٹارچ خرید لوں گا۔ معاذ نے کہا۔ ''میں بھی ایک ٹارچ خریدوں گا اور عتیق تم کیمرے میں فلم ڈلوانے کی بات کر رہے تھے کیوں کہ تمہاری فلمیں رائے صاحب کے گھر رہ گئی تھیں۔ تم اگر کیمرے میں فلم نہیں ڈلواؤ گے تو پرندوں کی تصویریں کیسے لے سکو گے، تم قصبے سے فلمیں بھی خرید سکتے ہو۔'' لڑکیوں نے بھی کچھ چیزیں خریدنی تھیں، پرویز صاحب خوشی خوشی انہیں اگلے دن ساتھ لے جانے کو تیار ہو گئے۔ صبح وہ سبھی کار میں سوار ہو گئے، وہ بہت خوش تھے۔ تزئین نے بتایا۔ ''صغیر بھی آج قصبے میں جا رہا ہے۔ یہ بہت مزے کی بات ہو گی، اگر اس کی نظر ہم پر پڑی کیوں کہ وہ ہمیں دیکھ کر حیران ہو جائے گا۔''

پرویز صاحب کی کار بہت خوبصورت تھی۔ لڑکوں نے اس کا جائزہ بڑی خوشی سے لیا تھا کیوں کہ وہ اکثر کاروں کے متعلق جانتے

تھے۔ عتریق کہنے لگا۔ "یہ کار بالکل نئی نکور ہے اور یہ بڑی تیز رفتار بھی ہے۔ پرویز صاحب، کیا آپ بہت امیر آدمی ہیں کیوں کہ یہ کار بیش قیمت ہے، آپ ضرور امیر ہیں۔" پرویز صاحب ہنسنے لگے۔ "نہیں، اتنا نہیں لیکن آؤ اب چلیں۔" پھر جیسے ہی انہوں نے ساحل سمندر کو پیچھے چھوڑا، بڑی سبک خرامی سے رواں دواں ہو گئے۔ کار میں وہ بہت مزے کا سفر کر رہے تھے اور انہیں دھچکے نہیں لگ رہے تھے۔ تزئین بولی۔ "یہ کار چچی جان کی کار سے کتنی مختلف ہے، یہ ہمیں بہت جلد قصبے میں پہنچا دے گی۔" واقعی بہت جلد وہ قصبے میں تھے۔ پرویز صاحب نے کار پارکنگ میں کار کھڑی کی اور پھر کسی کام کے لیے تنہا روانہ ہو گئے۔ انہوں نے بچوں سے کہا کہ وہ دوپہر کے کھانے کے وقت گرینڈ ہوٹل آ جائیں، وہاں ملاقات ہو گی۔ "عتریق کہنے لگا۔ "پتا نہیں پرویز صاحب کدھر گئے ہیں، کتنا اچھا ہوتا اگر وہ ہمیں اپنے ساتھ ہی رکھتے۔ میں ان کے ساتھ حنوط کئے جانوروں کی دُکان پر جانا چاہتا تھا اور وہاں حنوط کئے ہوئے پرندے دیکھنا چاہتا تھا۔"

تزئین بولی۔ "تو اب تم خود ہی دیکھ سکتے ہو کیوں کہ وہ ہمیں ساتھ لے کر نہیں جانا چاہتے تھے۔" وہ بھی مایوس تھی۔ وہ پرویز صاحب سے بہت متاثر تھی، اس نے کچھ پیسے بھی جمع کئے تھے تاکہ تشکر کے اظہار کے لیے ان کے لیے ایک آئس کریم خریدے۔ وہ کہنے لگی۔ "میرا خیال ہے کہ وہ اپنے کاروبار کے سلسلہ میں کہیں گئے ہیں۔" نایاب نے پوچھا۔ "ان کا کاروبار کیا ہے؟ وہ پرندوں پر تحقیق کے علاوہ بھی کچھ تو کرتے ہی ہوں گے۔" عتریق بولا۔ "انہوں نے اپنے کاروبار کے بارے میں ہمیں کبھی کچھ نہیں بتایا لیکن وہ بتائیں بھی کیوں؟ وہ ہماری طرح بچے تھوڑی ہیں۔ بڑے ہو کر سب بدل جاتے ہیں۔ چھوڑو ان باتوں کو اور وہ دُکان ڈھونڈیں جہاں ٹارچیں بکتی ہیں۔" پھر انہوں نے جو دُکان ڈھونڈی وہاں انہیں بہت اچھی اچھی ٹارچیں مل گئیں جن کی روشنی بہت زیادہ تھی۔ بچے ذہن میں سوچ کر خوش ہو رہے تھے کہ ان ٹارچوں کی روشنی سے خفیہ راستہ بھی جگمگا اُٹھے گا۔ ان سب نے ایک ایک ٹارچ خرید لی۔ تزئین بولی۔ "اب ہمیں اپنے کمروں میں بھی موم بتیاں جلانے کی ضرورت نہیں رہے گی، ہم اپنی ٹارچیں استعمال کر سکتے ہیں۔" پھر وہ عتریق کے کیمرہ کے لیے فلمیں خریدنے گئے۔ انہوں نے بسکٹ اور ٹافیاں خریدیں اور سب نے پیسے ڈال کر چچی جان کے لیے خوشبو کی ایک بوتل بھی خریدی۔ عتریق کہنے لگا۔ "اب بہتر ہے کہ ہم کیکی کے لیے بھی سورج مکھی کے بیج خرید لیں۔" یہ بات سن کر کیکی نے خوشی سے چیخ ماری۔ وہ معمول کے مطابق عتریق کے شانے پر براجمان تھا اور خلاف معمول آج بہت شریف بنا ہوا تھا۔ ہر راہگیر حیران ہو کر اسے دیکھ رہا تھا اور توتے کو یہ سب بہت بھلا لگ رہا تھا لیکن ایک شرارتی لڑکے کو دیکھ کر وہ بولا۔ "شرارتی لڑکے! سیٹی مت بجاؤ۔"

اصل میں اسے سورج مکھی کے بیج کھانا بہت پسند تھا اور وہ دُکان پر بھی سب سے چھپ کر منہ میں ڈال بھی چکا تھا۔ کچھ دیر بچوں نے ایسے ہی دُکانوں میں وقت گزارا تاکہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو جائے اور وہ گرینڈ ہوٹل میں پرویز صاحب کو جا ملیں۔ تبھی اچانک انہیں صغیر نظر آ گیا، وہ اپنی پرانی کار کو چلاتا ہوا آ رہا تھا۔ ایک عورت سڑک عبور کر رہی تھی اور وہ اسے ہارن بجا کر متنبہ کر رہا تھا۔ بچوں نے ایک دوسرے کو تھام لیا، اس سے پہلے کہ اس کی نظر ان پر پڑتی اور پھر اس کی نظر واقعی ان پر پڑ ہی گئی۔ اس نے سب سے پہلے معاذ کو دیکھا، پھر اسے عتریق نظر آیا جس کے شانے پر کیکی بیٹھا ہوا تھا اور پیچھے آتی ہوئی دونوں لڑکیاں۔ وہ بچوں کو حیرت سے دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ کار سڑک پر اِدھر اُدھر ہچکولے کھانے لگی اور ایک پولیس آفیسر اس کے نیچے آتے آتے بچا۔ وہ پولیس آفیسر غصے میں چلایا۔ "اوئے پاگل! تم نشے میں تو نہیں ہو؟" صغیر نے پولیس آفیسر سے معافی مانگی اور پھر بچوں کی طرف دیکھنے لگا۔ عتریق نے دوسرے ساتھیوں کو کہا۔ "بھاگو مت، وہ کار میں بیٹھ کر ہمارا پیچھا نہیں کر سکتا، صرف چلتے رہو اور اسے نظرانداز کر دو، لہٰذا وہ باتیں کرتے سڑک کے کنارے چلتے رہے اور ایسا ظاہر کرتے رہے جیسے انہوں نے صغیر کو دیکھا ہی نہ ہو۔ صغیر ان کو جو آوازیں دے کر بلا رہا تھا، ان کو بھی انہوں نے نظرانداز کر دیا۔ صغیر کو اپنی بینائی پر شبہ ہو رہا تھا۔ بچے قصبے تک کیسے پہنچے، وہ بس پر آئے تھے اور نہ وہاں کوئی ریل گاڑی تھی، اور نہ ہی کوئی اور سواری، ان کے پاس سائیکل بھی نہیں تھے۔ اتنا زیادہ فاصلہ وہ پیدل ہرگز طے نہیں کر سکتے تھے تو پھر وہ یہاں تک کیسے پہنچ گئے تھے؟ صغیر جلدی جلدی کار کو پارک کرنے گیا تاکہ بچوں کو پوچھے

کہ وہ یہاں کیسے پہنچے؟ اس نے کار پارک کی اور چھلانگ لگا کر گاڑی سے اُترا۔ پھر وہ بچوں کے پیچھے دوڑ پڑا لیکن اس وقت تک بچے گرینڈ ہوٹل پہنچ چکے تھے جہاں انہیں پرویز صاحب کو ملنا تھا۔ وہ جلدی سے ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔ صغیر کو جرأت نہیں ہوئی کہ بچوں کے پیچھے گرینڈ ہوٹل میں جا گھسے۔ وہ ہوٹل کی سیڑھیوں کے نیچے کھڑا ہو گیا اور سخت غصے میں ان کا انتظار کرنے لگا۔ پہلے تو یہ اس کے لیے حیرت کی بات تھی کہ بچوں کو قصبے میں دیکھے لیکن اس سے بھی حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ آرام سے قصبے کے سب سے مہنگے ہوٹل میں گھس جائیں۔ صغیر غصے میں ہوٹل کی سیڑھیوں میں ہی بیٹھ گیا۔ وہ اس بات کا انتظار کر رہا تھا کہ بچے ہوٹل سے باہر نکلیں تو وہ انہیں پکڑ کر کار میں سوار کرے۔ بچوں کو سیدھا گھر لے جائے اور چچی جان کو بتائے کہ وہ انہیں کہاں سے پکڑ کر لایا ہے۔ وہ قطعی یہ پسند نہیں کریں گی کہ بچے اتنے مہنگے ہوٹل میں پیسے اُڑاتے رہیں حالاں کہ وہ گھر سے سینڈوچ وغیرہ بنوا کر لے جا سکتے تھے۔ بچوں کی بے اختیار ہنسی چھوٹ رہی تھی جب وہ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔

پرویز صاحب ہوٹل کے لاؤنج میں ان کا انتظار کر رہے تھے، انہوں نے بچوں کو منہ دھونے اور بال سنوارنے کی جگہ بتائی۔ وہ صاف ستھرے ہو کر کچھ منٹوں میں دوبارہ اکٹھے ہو گئے اور پھر کھانا کھانے ہوٹل کی مقررہ جگہ کی طرف چل دیئے۔ کیا زبردست کھانا تھا، بچوں کے آگے جو بھی رکھا گیا بچے اسے چٹ کر گئے اور پھر کھانے کے بعد بڑی بڑی آئس کریمیں ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ تزئین کہنے لگی۔ ”پرویز صاحب! بہت مزے کا کھانا تھا، اتنا شاندار، بہت بہت شکریہ!“ یہ کہہ کر وہ ہوٹل کی آرام دہ کرسی میں نیم دراز ہو گئی۔ نایاب بولی۔ ”پرویز صاحب! آپ کروڑ پتی تو ضرور ہوں گے۔ میں نے اتنا کھا لیا ہے کہ میں اُٹھ کر چل بھی نہیں سکتی۔“ کروڑ پتی والی بات اس نے بیرے کو پرویز صاحب کی بخشش دینے پر کی تھی۔

تب عتریق کو صغیر یاد آ گیا۔ اسے پکا یقین تھا کہ صغیر ان کا انتظار کر رہا ہو گا۔ پھر وہ اسے دیکھنے کے لیے اُٹھا۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا جہاں سے ہوٹل کا باہری حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ صغیر ہوٹل کی سیڑھیوں میں بیٹھا شدت سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ عتریق ہنستا ہوا باقی ساتھیوں کے پاس آیا۔ اس نے پرویز صاحب سے پوچھا۔ ”کیا نکلنے کے لیے ہوٹل کا کوئی عقبی دروازہ بھی ہے؟“ یہ سن کر پرویز صاحب حیران رہ گئے۔ انہوں نے کہا۔ ”ہاں ہے، لیکن آخر کیوں؟“ عتریق بولا۔ ”کیوں کہ صغیر ہوٹل کے مرکزی دروازے پر ہمارا انتظار کر رہا ہے۔“ پرویز صاحب نے حالات سمجھتے ہوئے سر کو ہلایا۔ انہوں نے کہا۔ ”تو ٹھیک ہے، ہم خاموشی سے عقبی دروازہ استعمال کرتے ہیں۔ آؤ! اب یہاں سے نکلیں، کیا تم نے اپنی ساری چیزیں خرید لیں ہیں؟“ بچوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ”جی ہاں!“ اور پھر پرویز صاحب کے پیچھے چلنے لگے۔ وہ انہیں ہوٹل کے عقبی دروازے سے باہر لے گئے جو ایک خالی گلی میں کھلتا تھا۔ وہ وہاں گئے جہاں پرویز صاحب کی کار کھڑی تھی۔ سب اس میں سوار ہو گئے۔ وہ اتنا اچھا دن ملنے پر بہت خوش تھے۔ وہ تیز رفتاری سے ساحل سمندر پر پہنچے، گھر کے نزدیک جا کر کار سے اُترے اور چٹان پر چڑھنے لگے تاکہ صغیر سے پہلے پہلے گھر پہنچ جائیں۔ وہ ان کے پہنچنے کے قریب ایک گھنٹہ بعد پہنچا اور بڑا غمگین لگ رہا تھا۔ اس نے کار کھڑی کی اور گھر پہنچا۔ گھر پہنچ کر جو پہلی چیز اس نے دیکھی، وہ چاروں بچے تھے جو چٹانوں پر کھیل رہے تھے۔ وہ کھڑا ہو کر غصے اور حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

کہیں نہ کہیں دال میں کچھ کالا تھا اور صغیر نے مصمم ارادہ کیا تھا کہ وہ اس راز کو بے نقاب کر کے رہے گا۔ اس نے دل میں ٹھان لیا تھا کہ وہ ان چار بچوں سے دھوکہ نہیں کھائے گا اور نہ ہی شکست!!!

## صغیر سے دوبارہ دھوکہ

صغیر بار بار اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش میں جتا رہا کہ آخر بچے کیسے قصبے میں گئے جب کہ وہ پیدل چلنے کے علاوہ کسی اور کے ذریعے سے نہیں جا سکتے تھے اور جتنے وقت میں وہ واپس بھی پہنچ گئے تھے اتنی دیر میں بچے تو نہیں البتہ جِن یہ کام کر سکتے تھے۔ آخر وہ سوچ سوچ کر اس نتیجے پر پہنچا کہ ضرور وہ کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں جو اپنے طور پر انہیں قصبے تک لے کر گیا اور پھر واپس بھی لایا۔ یہ سوچ کر اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ سختی سے ان بچوں کی نگرانی کرے گا۔ وہ جان بوجھ کر ایسے کام ڈھونڈنے لگا جنہیں کرتے وقت وہ بچوں پر نظر بھی رکھ سکے۔ اگر وہ سمندر کے کنارے جاتے تو صغیر وہاں پہلے سے موجود ہوتا، اور ظاہر کرتا کہ وہ لکڑی کے ٹکڑے اکٹھے کر رہا ہے۔ اگر وہ گھر میں رہتے تو وہ بھی گھر سے

باہر نہ نکلتا۔ اگر وہ چٹان پر چڑھتے تو صغیر ان کے پیچھے ہوتا۔ بچوں کے لیے وہ سر درد بن چکا تھا۔ نایاب کہنے لگی۔ ”اگر ہم پرویز صاحب کو ملنے گئے تو یہ ہمارے پیچھے آئے گا اور اسے پرویز صاحب کا علم ہو جائے گا۔ ہم کل سے اسی وجہ سے انہیں ملنے نہیں جا سکے ہیں اور اگر یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا تو ہم آج اور کل بھی انہیں نہیں مل سکیں گے۔ اب صغیر کو دھوکہ دینا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ بہت کایاں تھا اور ہر وقت بچوں پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ بچوں کی جان مصیبت میں آئی ہوئی تھی۔ دونوں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ مینار والے کمرے میں گئیں، رات ہو گئی تھی اور وہ یہی مسئلہ حل کرنے کے لیے بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ عتریق اچانک بولا۔ ”مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے جس سے ہم آسانی سے دھوکہ دے سکتے ہیں اور اسے کاٹھ کا اُلو بھی بنا سکتے ہیں۔“ سب نے یک زبان ہو کر اس سے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

عتریق نے کہا۔ ”ہم سب غاروں میں جاتے ہیں اور پھر سوراخ سے خفیہ راستے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ پھر گھر کے نیچے تہہ خانوں میں پہنچتے ہیں اور وہاں سے رفوچکر ہو جاتے ہیں۔ صغیر ساحل سمندری پر غار کے کنارے ہمارا انتظار کرتا ہی رہ جائے گا اور ہم چٹانوں سے ہوتے ہوئے دوسری سمت پرویز صاحب کو ملنے چلے جائیں گے۔“ معاذ کہنے لگا۔ ”یہ تو بہت شاندار ترکیب ہے۔“ لڑکیوں کو اس ترکیب کی کامیابی میں کچھ شبہ تھا، وجہ وہی پرانی تھی کیوں کہ وہ خفیہ راستے سے گزرنا نہیں چاہتی تھیں۔ پھر بھی سب نے اپنی ٹارچیں خرید لی تھی، ان کے استعمال کا یہ اچھا وقت تھا، لہٰذا اگلے دن جب صغیر چاروں بچوں کے پیچھے تھا، وہ کیکی کو ساتھ لیے ساحل سمندر پر چلے گئے۔ معاذ نے کہا۔ ”صغیر! خدا کے واسطے ہمارا پیچھا چھوڑ دو، ہم غاروں میں جا رہے ہیں اور وہاں سے ہم تمہارے لیے دردِ سر نہیں بن سکتے۔ اب چلے بھی جاؤ!“ صغیر نے پرانی گھسی پٹی بات دہرائی۔ ”چچی نے مجھے حکم دے رکھا ہے کہ تم پر ہمہ وقت نظر رکھی جائے۔“ یہ بات وہ بچوں سے ہزاروں دفعہ پہلے بھی کر چکا تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ اصل وجہ کیا ہے۔ صغیر دوسروں کے کاموں میں ٹانگ اڑانے کو اپنی شان سمجھتا تھا۔ وہ جو کوئی کام بھی کرتے صغیر اس میں اپنی ٹانگ ضرور اڑاتا۔ وہ غاروں میں چلے گئے اور صغیر باہر آوارہ گردی کرتے ہوئے رہ گیا۔ وہ اپنے تھیلے میں لکڑی کے ٹکڑے جو لہروں میں سے بہہ کر آتے تھے، ڈال رہا تھا۔ بچے سوراخ کے قریب پہنچے اور پھر اس کے ذریعے خفیہ راستے میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے اپنی ٹارچیں روشن کر لیں تا کہ راستہ روشن ہو سکے۔ لڑکیاں مسلسل ناک منہ چڑھا رہی تھیں۔ انہیں وہاں کی بو سے گھن آ رہی تھی اور جب انہیں احساس ہوا کہ راستے میں کچھ وقت سانس لینے میں بھی دشواری ہو گی تو وہ ٹھہر گئیں۔

معاذ نے انہیں بتایا۔ ”اب واپس جانا ممکن نہیں، ہم آدھے راستے سے بھی آگے آ گئے ہیں۔ تزئین! اب آگے بڑھو، تمہاری وجہ سے سب جمے کھڑے ہیں۔“ تزئین کہنے لگی۔ ”مجھے دھکا مت دو، جہاں میرا دل کرے گا میں ٹھہروں گی۔“ عتریق اکتا کر سختی سے بولا۔ ”تم دونوں بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔“ میرا خیال ہے تم دوبارہ لڑنے کی تیاری کرنے لگے ہو۔ تم تو ایسے ظاہر کر رہے ہو جیسے تمہارا بحری جہاز غرق ہونے والا ہے جس میں تم سوار ہو۔ تزئین، میری بہن چلو! ہم جلدی سے یہاں سے نکل جائیں گے۔ ” ہو سکتا ہے تزئین معاذ کی طرح عتریق سے بھی بحث شروع کر لیتی مگر کیکی کو پتا نہیں کیا سوجھی کہ وہ بالکل صغیر کی طرح کھانسنے لگا بچے پہلے تو ڈر گئے کہ شاید صغیر خفیہ راستے سے ان تک آن پہنچا ہے لیکن اس سے فائدہ یہ ہوا کہ رُکی ہوئی تزئین آگے بڑھنے لگی۔ عتریق نے اطمینان کا سانس لیا۔ کیکی دوبارہ کھانسا تو وہ بولا۔ ”پریشانی کی کوئی بات نہیں، یہ اپنا کیکی ہمیں ڈرا رہا ہے۔“ پھر وہ آگے بڑھنے لگے اور آخر کار راستے کے اختتام پر آن پہنچے اور اپنے سروں پر موجود دوسرے راستے کو گھورنے لگے جو اب ٹارچوں کی روشنی میں انہیں بخوبی نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے زور لگا کر اسے کھولا تو اس کے کواڑ اوپر کی طرف گر گئے۔ لڑکے تہہ خانے کے فرش پر چڑھے اور پھر لڑکیوں کو اوپر چڑھنے میں مدد کی اور پھر دروازہ بند کر دیا۔ وہ دوسرے تہہ خانے کے دروازے پر پہنچے، وہ بھی بند تھا۔ انہوں نے اسے دھکا دے کر کھول لیا۔ ڈبے ایک زوردار آواز سے پھر دوسری جانب گر گئے۔ لڑکے راستے کے ذریعے اندر چلے گئے اور ڈبوں کو پھر ترتیب سے رکھ دیا اور تہہ خانے کی سیڑھیوں سے باورچی خانے میں چلے گئے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ خوش قسمت تھے، وہ وہاں سے نکلے اور چٹانوں پر چلے گئے۔ (باقی آئندہ)

☆☆☆




**مدیرہ تعلیم و تربیت، السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟**

آپی آپ کا کیا حال ہے امید ہے خیریت سے ہوں گی۔ میں دوسری بار اس رسالے میں شرکت کر رہا ہوں۔ پچھلی بار تو خط چھپا نہیں اس لیے بہت اداس ہوا لیکن ہمت نہ ہاری اور پھر قلم اٹھا ہی لیا اور خط لکھنے لگا۔ بات کی جائے فروری 2018ء کے شمارے کی تو یہ باقی تمام رسالوں سے زیادہ اچھا تھا۔ ''لال ٹوپی والی'' ایک سبق آموز کہانی تھی۔ ''ولیم اور سیب'' اور ''کشمیر کی حور'' بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ کہانی ''ہماری زمین'' سے ماحول کو صاف رکھنے کا درس ملا اور باقی تمام کہانیاں سپر ہٹ تھیں۔ ابھی پورا رسالہ نہیں پڑھا امید ہے وہ بھی اچھا ہوگا۔ اس بار ''کھوج لگایئے'' اور ''بلاعنوان'' میں بھی حصہ لے رہا ہوں۔ امید ہے کہ عنوان پسند آئے گا اور اگر اللہ نے چاہا تو انعام کا حق دار ضرور ٹھہروں گا اور میرا خط بھی ضرور چھپے گا۔ آپی بڑی امید سے خط لکھا ہے پلیز ضرور منتخب کیجیے گا اور مجھے تو خط چھپنے کا جواب بھی آ چکا ہے۔ آپی آپ سے پوچھنا تھا کہ کوپن کو اندر چپکانا ہے یا باہر۔ آخر میں اس شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

من میں نور ہے دل میں سرور ہے
کون کہتا ہے ''تعلیم و تربیت'' مجھ سے دور ہے

(حسن مختار، آزاد کشمیر)

☆ ڈیئر حسن! انعام کے لیے قرعہ اندازی کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کوپن ایک صفحے پر چپکا دیں۔

ڈیئر آپی! خوب صورت سا رسالہ آیا، ساتھ بہار لایا۔ ہمیشہ کی طرح ایک ہی بار میں پڑھ لیا۔ یہ ایسا رسالہ ہے جس سے ناراض نہیں رہا جا سکتا۔ تعلیم و تربیت اور میرا ساتھ بہت پرانا ہے۔ ہر بار کی طرح رسالہ زبردست اور تمام کہانیاں ٹاپ پر رہیں۔ مگر جس کہانی نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ ''ویران جزیرے کا راز'' ہے۔ بہت خوب صورت سی تحریر ہے۔ بڑی خواہش ہے کہ تعلیم و تربیت میں میرا نام ہو۔ اس بار بہت سی تحریروں کے ساتھ پھر حاضر ہوں۔ شاید کوئی تحریر آپ کے معیار پر پوری اترے۔

(ایمن کائنات، نیلوفر جاوید، ڈیرہ غازی خان)

☆ آپ کی تحریریں معیاری ہوئیں تو ضرور چھپیں گی۔

تعلیم و تربیت کا رسالہ بہت مزے کا ہوتا ہے۔ میری چھوٹی بہن اور بھائی بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی کر کر کے پڑھتے ہیں کہ پہلے میں پڑھوں۔ میں آپ سے ناراض ہوں میں نے پہلے بھی خط، کہانیاں اور دوسری چیزیں بھیجی تھیں اور آپ نے شائع نہیں کیں۔ اب میں تیسری مرتبہ بہت مشکل سے ٹائم نکال کر خط لکھ رہی ہوں پلیز مہربانی فرما کر میرا خط شائع کریں۔ آپ کی بہت احسان مند رہوں گی۔ پلیز میں اپنے خط کا انتظار کروں گی۔ اگر میرا خط شائع ہو گیا پھر تب دوبارہ کہانی لکھ کر بھیجوں گی۔ آپ خوش رہیں اور اللہ آپ کو لمبی زندگی دے اور میری گزارش ہے کہ ''معلومات عامہ'' زیادہ سے زیادہ بھیجا کریں کیوں کہ میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ (حفصہ صادق، واہ کینٹ)

☆ آپ کی کہانیاں ملیں گی تو ضرور شائع کریں گے۔ احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ معلومات عامہ اکثر و بیشتر شائع ہوتی رہتی ہیں۔

آپی کیسی ہیں آپ؟ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو خوش رکھے (آمین ثمہ آمین) آپی اس بار بھی سارا رسالہ اپنی مثال آپ تھا۔ آپی کیا بتاؤں جب بھی رسالے میں اپنی کوئی تحریر نہ ہو تو کیسا لگے گا۔ وہی حال ہمارا بھی ہے۔ آپی فون نمبر دے کر بھی آپ فون کیوں نہیں اٹھاتے۔ فون اٹھایا کریں۔ شکریہ۔ کاش کہ ہمارا ڈاکیا بھی گگو میاں کی کہانی کی طرح ہوتا تو آج سائرہ حبیب کا انعام مل گیا ہوتا۔ آپی اس بار ہمارا پورا خط شائع کر دیں۔ شکریہ۔

(غزالہ حبیب، تاندلیانوالہ)

☆ غزالہ! آپ اپنی مزید تحریریں بھیجیں۔ آپ ہمیں اپنا ٹیلی فون نمبر ارسال کریں۔ بعض اوقات میں اپنی سیٹ پر نہ ہوں تو کال نہیں سنی جاتی۔ بہرحال خط کا شکریہ۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ اسے شائع

ضرور کیجیے گا۔ ''تعلیم و تربیت'' ایک بہترین رسالہ ہے۔ میں اسے بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ ''کھوج لگائیے'' بہترین سلسلہ ہے۔ اس ماہ کے رسالے میں سب سے زبردست کہانی ''بیس سال بعد'' اور ''کشمیر کی حور'' تھیں۔ امید ہے آپ میرا خط ضرور شائع کریں گی۔ اللہ ''تعلیم و تربیت'' کو روز بروز ترقی عطا فرمائے۔ آمین!

(زینب وقار، سیال کوٹ کینٹ)

☆ خط لکھنے کا شکریہ!

آپی کیسی ہیں آپ؟ میں نے بہت عرصے پہلے آپ کو خط لکھا تھا۔ آپ نے شائع کیا تھا۔ یاد کیجیے۔ اچھا تو سب سے پہلے رسالے کی طرف آتے ہیں۔ پورا شمارہ لاجواب تھا۔ شکاریات کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ کشمیر کی حور بہترین کہانی تھی۔ لطائف بہت عمدہ تھے۔ آپ قندِ مکرر کا سلسلہ جاری رکھیے۔ کھڑکھاند گروپ بہت اچھا سلسلہ تھا۔ آپ پلیز اسے دوبارہ شائع کیجیے۔ آپ سے چھوٹی سی فرمائش ہے کہ جاسوسی کہانیاں بھی شائع کریں۔ اچھا جی میں نے آپ سے پوچھنا ہے کہ آپ کو یاد ہے آپ نے میرا خط کب شائع کیا تھا؟ چلیں میں بتاتی ہوں پچھلے سال مارچ کے مہینے میں شائع کیا تھا۔ اب پھر شائع کر دیں پلیز۔ پھر یہ اس کی سال گرہ ہو جائے گی نا! آپ بہت بہت اچھی ہیں۔ میرا خط شائع کریں ورنہ خط رو پڑے گا کہ اس کی سال گرہ نہیں ہوئی۔ (تحریم نور)

☆ اگلے ناول کا انتخاب آپ سب بچوں کی فرمائش کو مدنظر رکھ کر کیا جائے گا۔

پیاری آپی! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ میں نے بہت مہینوں سے کسی بھی سلسلے میں حصہ نہیں لیا۔ کیا کروں اب میں بڑی ہو گئی ہوں اس لیے پڑھائی زیادہ ہو گئی ہے لیکن وقت نکال کر یہ خط لکھ رہی ہوں۔ فروری کا شمارہ زبردست تھا۔ سرورق بہت خوب صورت تھا۔ ساری کہانیاں اچھی تھیں۔ ندامت کے آنسو بہت سبق آموز تھی۔ آپ کھیل اور کھلاڑی کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی رات چگنی ترقی دے۔ آمین! پاکستان زندہ باد۔

(ایمن ذوالفقار، نوشہرہ)

☆ دعاؤں اور پسندیدگی کا شکریہ کھیل اور کھلاڑی کا سلسلہ جلد دوبارہ شروع کر دیا جائے گا۔

پہلی مرتبہ ''تعلیم و تربیت'' جیسے عظیم رسالے میں شرکت کرنے پر مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے۔ ''تعلیم و تربیت'' ایک منفرد اور اپنی مثال آپ ہے۔ یہ رسالہ ہمیں ہمیشہ سے ''سبق آموز کہانیاں'' دل چسپ مضامین اور حیرت انگیز معلومات سے پُر ملتا ہے۔ ''تعلیم و تربیت'' کا نام بالکل اس رسالے کے ساتھ موزوں ہے کہ اس رسالے سے نہ صرف ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ یہ رسالہ ہماری تربیت کا بہترین ذریعہ ہے۔ فی الحال میں پہلی مرتبہ صرف خط ارسال کر رہا ہوں۔ تاہم آئندہ ان شاء اللہ دیگر چیزوں میں بھی حصہ لوں گا۔ امید ہے کہ آپ میرے اس پیارے اور پرخلوص خط کو اپنی شفقت کے سایہ میں جگہ عطا فرمائیں گے۔ اگر کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی درست کیجیے گا۔

(زبیر بن سلطا شاہ، کراچی)

☆ تعریف اور حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ ضرور حصہ لیجیے ہمیں انتظار رہے گا۔

میں تعلیم و تربیت کو تقریباً آٹھ سال سے پڑھ رہا ہوں اور خط بھی لکھے ہیں مگر شائع نہیں ہوئے مجھے امید ہے کہ آپ اس دفعہ ضرور شائع کریں گے۔ اب رسالے کی طرف آتے ہیں آپئے مسکرائیں پڑھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ ہندسے کس نے ایجاد کیے۔ یہ پڑھ کر معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ 20 سال بعد سبق آموز کہانی تھی ویران جزیرے کا راز اچھا سلسلہ ہے۔ ندامت کے آنسو بھی سبق آموز تھی اور باقی تمام کہانیاں بھی ٹاپ پر تھیں۔ میں کچھ تحریریں وغیرہ بھیج رہا ہوں جگہ ہو تو ضرور شائع کریں۔ آخر میں شعر:

تعلیم میں بھی تو آگے تربیت میں بھی تو آگے
تجھے بنانے والے دنیا کے اہل مصنفین میں بھی آگے

(نعمان اکرم، اوکاڑہ)

☆ جی! اپنی تحریریں ضرور بھیجیں۔ شعر کا شکریہ۔

☆ مسز فریدہ گوہر، ملتان۔ تنقید و تجاویز کا بہت شکریہ۔ آپ کے خطوط رسالہ چھپنے کے بعد ہی ملتے ہیں۔ لہٰذا اپریل کے شمارے میں تحریریں چھپ سکتی ہیں۔

**جگہ کی کمی کے باعث صرف نام شائع کیے جا رہے ہیں:**

محمد شاس حسین، بہاول پور۔ محمد ابراہیم، واہ کینٹ۔ محمد سالار، گوجر خان۔ حنیف ادیب، سلمان یوسف سمیجہ، علی پور۔ محمد روشان، لاہور۔ ثمرہ احمد سعید، ڈسکہ۔ فضہ گل، نوشہرہ۔ حفصہ اعجاز، بازہ ہملٹ، صوابی۔ محمد بلال، لائبہ فاطمہ، لاہور۔ عیشہ فاطمہ، فیصل آباد۔ حافظ خنساء اقبال، جہانیاں۔ حسن رضا سردار، کاموکی۔ احور کامران، لاہور۔ طلعت صدیقی، کراچی۔ صغیر احمد، ڈیرہ غازی خان۔ طٰہٰ نذیر، منڈی بہاؤ الدین۔ سعادیہ شفیق، ملتان۔ سامعہ رضا، شیخوپورہ۔ احمد سلطان، کوئٹہ۔ ثمن اقبال، جھنگ۔ درنایاب، گوجرانوالہ۔ محمد بلال، گجرات۔ محمد حسن، لاہور۔ عاطفہ اکرم، کراچی۔ بلال رضوان، سیال کوٹ۔




کلاس روم کے پیچھے میں نے اپنے چار دوستوں کے ساتھ فرش کا ایک اکھڑا ہوا تختہ پایا۔ اس کو ہم نے چاقو کے پھل سے اوپر اٹھایا تو اس کے نیچے ایک گڑھا تھا۔ ہم نے اسے اپنی ٹافیوں گھونگھوں اور پرندوں کے انڈے چھپانے کے لیے موزوں جگہ پایا۔ ہر دوپہر کو آخری سبق کے بعد ہم کلاس روم خالی ہونے کا انتظار کرتے اور پھر اس تختے کو اٹھا کر گڑھے میں یا تو کچھ ڈال دیتے اور یا وہاں سے کچھ نکال لیتے۔

ایک دن جب ہم نے اس تختے کو اٹھایا تو وہاں ہمیں ایک مردہ چوہا ملا۔ ہمارے لیے یہ حیران کن دریافت تھی۔ تھوئیس نے اس کی دم سے پکڑ کر اسے اٹھایا اور ہمارے چہروں کے سامنے لہرایا۔

''اس کا کیا کریں؟'' اس نے چیخ کر کہا۔

''ٹھہرو'' میں نے کہا۔ ''اسے مت پھینکو۔''

تھوئیس جھجکا۔ باقی دوستوں نے میری طرف دیکھا۔ اپنے بارے میں لکھتے وقت ہمیں راست گوئی سے کام لینا چاہیے۔ سچائی عاجزی سے بہتر ہے۔ اس لیے مجھے یہ بتاتے ہوئے کوئی باک نہیں کہ اپنے دوستوں میں سے چوہے کے اس ''عظیم منصوبے'' کو صرف میں ہی جانتا تھا۔ ہم سب پر ذکاوت (ذہانت) اور فتح مندی کا ایک لمحہ آتا ہے اور یہ میرا لمحہ تھا۔ ''کیوں نہ ہم'' میں نے کہا۔ ''اسے مسز پریشچیٹ کی مٹھائیوں کے کسی جار میں ڈال دیں؟ پھر جب وہ اس میں اپنا گندا ہاتھ مٹھائی لینے کے لیے ڈالے گی تو اس کے ہاتھ میں ایک بدبودار چوہا آئے گا۔''

دوستوں نے میری طرف اچنبھے سے دیکھا۔ پھر جیسے ہی انہیں میرے اس عظیم منصوبے کی سمجھ آئی تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔ انہوں نے میری پیٹھ تھپتھپائی اور میری عقل کی داد دیتے ہوئے وہ کلاس روم کے اردگرد ناچنے لگے۔

''یہ کام ہم آج ہی کریں گے۔'' انہوں نے چلاتے ہوئے کہا۔

''گھروں کو لوٹتے ہوئے ہم یہ کام کریں گے۔ تم نے کیا آئیڈیا سوچا ہے؟'' انہوں نے کہا۔ ''چوہے کو جار میں ڈالنے کا کام تم ہی کرو گے۔''

تھوئیس نے چوہا مجھے تھما دیا اور میں نے اسے پینٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ پھر ہم اسکول سے روانہ ہوئے۔ کھیتوں کو پار کیا اور مٹھائی کی دکان کی طرف بڑھے۔ ہم پرجوش تھے اور ایسے جتھے کی مانند چل رہے تھے جیسے ہم کوئی ٹرین لوٹنے چلے ہوں یا کسی شیرف کا دفتر اڑانے چلے ہوں۔

''اس بات کو یقینی بنانا کہ چوہا اس جار میں رکھو جو عام طور پر استعمال ہوتا ہو۔'' ایک دوست نے کہا۔

"میں اسے گابز ٹاپرز (Gobstoppers) (مٹھائی کا نام) والے جار میں رکھوں گا کیوں کہ یہ ہمیشہ کاؤنٹر پر آگے رکھا ہوتا ہے۔"

"میرے پاس ایک پنی ہے۔" تھوئیس نے کہا۔ "سو میں ایک ٹافی اور جوتے کے تسمے کے لیے کہوں گا اور جب وہ یہ چیزیں لانے کے لیے پیٹھ موڑے گی تو تم جلدی سے اسے گابز ٹاپرز والے جار میں رکھ دینا۔"

یوں یہ چال طے ہوگئی۔ دکان میں داخل ہوتے وقت ہم اکڑ کر چل رہے تھے۔ اب ہم فاتح تھے اور پریشچت مفتوح۔ وہ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی تھی۔ ہمیں آگے بڑھتا دیکھ کر وہ ہمیں اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ہمیں مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"پلیز ایک ٹافی۔" تھوئیس نے پنی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں ساتھیوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ جب میں نے مسز پریشچت کو ڈبے سے ٹافی نکالنے کے لیے ایک دو سیکنڈ کے لیے سر گھماتے دیکھا تو میں نے گابز ٹاپرز کا بھاری ڈھکنا اٹھایا اور چوہا جار میں ڈال دیا اور نہایت آہستگی سے ڈھکن جار کے اوپر رکھ دیا۔ اب میرا دل زور سے دھڑک رہا تھا اور میرے ہاتھوں میں پسینہ آ رہا تھا۔

"اور بوٹ کا ایک تسمہ۔" میں نے تھوئیس کو کہتے سنا۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو مسز پریشچت اپنی میلی انگلیوں میں تسمہ تھامے ہوئے تھی۔

"اگر تم میں کسی ایک نے کچھ خریدنا تھا تو سارا مجمع کیوں اندر آ گیا ہے۔" وہ چلائی۔ "اب دفع ہو جاؤ۔"

دکان سے باہر نکل کر ہم دوڑ پڑے۔

"چوہا جار میں ڈال دیا؟" میرے ساتھیوں نے چلا کر پوچھا۔

"بالکل۔ ڈال دیا۔" میں نے کہا۔

"شاباش" وہ پھر چلائے۔ "زبردست تماشا ہوا ہے۔"

میں اپنے آپ کو ہیرو سمجھنے لگا۔ اتنی پذیرائی شان دار تھی۔

اگلی صبح جب ہم اکٹھے ہو کر اسکول جانے لگے تو مردہ چوہے والا کارنامہ دوبارہ سے گفتگو کا حصہ بنا۔

"چل کر دیکھتے ہیں کہ ابھی وہ جار میں ہی ہے۔" جوں ہی ہم مٹھائی کی دکان کے پاس پہنچے ایک لڑکے نے کہا۔

"نہیں۔" تھوئیس نے سختی سے کہا۔ ایسا کرنا خطرناک ہے۔ ہم دکان کے آگے سے یوں گزریں گے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔"

جیسے ہی ہم دکان کے سامنے آئے ہم نے دکان پر "بند ہے" کا نوٹس لٹکتا ہوا دیکھا۔

ہم رک کر اسے دیکھنے لگے۔ پہلے تو صبح کے وقت کبھی دکان بند نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اتوار والے دنوں میں بھی۔

"کیا ہوا؟" ہم سب نے ایک دوسرے سے پوچھا۔ "کیا معاملہ ہے؟" ہم نے شیشے کی کھڑکی کے ساتھ اپنے چہرے لگا کر اندر دیکھا۔ مسز پریشچت کہیں نظر نہیں آئی۔

"دیکھو" میں چلایا۔ "گابز ٹاپرز والا جار غائب ہے۔ شیلف پر نہیں ہے۔ جس جگہ یہ ہوتا تھا وہاں خلا ہے۔"

"یہ فرش پر ہے!" ایک لڑکا بولا۔ "یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے اور گابز ٹاپرز بکھرے پڑے ہیں۔"

"چوہا وہ رہا۔" ایک اور لڑکا چلایا۔

ہم سب نے دیکھا کہ جار کرچی کرچی ٹوٹ چکا تھا اور رنگ برنگے گابز ٹاپرز کے درمیان مردہ چوہا پڑا تھا۔ ایک لڑکا کہنے لگا: "جب اس کے ہاتھ میں چوہا آیا تو وہ ایسی خوف زدہ ہوئی کہ اس کے ہاتھ سے جار گر گیا۔"

"لیکن اس نے جھاڑو سے صفائی کر کے دکان کیوں نہیں کھولی؟" میں نے پوچھا۔

کسی نے میری بات کا جواب نہ دیا۔

ہم وہاں سے ہٹے اور اسکول کی طرف چل پڑے۔ اچانک ہم سب کو ایک پریشانی نے گھیر لیا۔ دکان کا بند ہونا اچھا نہیں تھا۔ تھوئیس بھی اس معاملے میں کچھ نہ کہہ سکا۔ ہم خاموش ہو گئے۔ ہوا میں خطرے کی بو تھی۔ ہم سب نے اسے محسوس کیا۔ اب ہمارے کانوں میں ہلکے ہلکے خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد تھوئیس نے خاموشی کو توڑا۔ "اسے صدمہ ہوا ہو گا" اس نے کہا۔ پھر تھوڑا توقف کیا۔ ہم سب نے اس کی طرف دیکھا اور انتظار کرنے لگے کہ اب تھوئیس کون سا طبی انکشاف کرنے والا ہے۔

"یہ صدمے والی بات تو ہے۔" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کہ جب آپ مٹھائی نکالنے کی غرض سے ہاتھ جار میں ڈالیں تو آپ کے ہاتھ میں مردہ چوہا آ جائے۔ میری بات غلط ہے کیا؟"

کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔

"تو" تھوئیس نے بات جاری رکھی۔ "جب مسز پریشچت جیسی بوڑھی عورت کو ایسے برے صدمے سے واسطہ پڑتا ہے، تو میرے خیال میں، تم سب جانتے ہو کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟"

"کیا نتیجہ" ہم سب نے کہا۔ "کیا نتیجہ نکلتا ہے؟"

"یہ بات آپ میرے والد سے پوچھیں۔" تھوئیس نے کہا۔ وہ آپ کو بتائیں گے۔ "تم بتاؤ ناں۔" ہم نے کہا۔

"اسے ہارٹ اٹیک ہوسکتا ہے۔" تھوئیس نے بتایا۔

اس کا دل دھڑکنا بند ہوسکتا ہے اور وہ پانچ سیکنڈز میں مر جائے گی۔"

ایک یا دو لمحوں کے لیے میرا اپنا دل دھڑکنا بند ہو گیا۔ تھوئیس نے انگلی سے میری طرف اشارہ کیا اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے تم نے اسے مارا ہے۔"

"میں نے؟" میں چلایا۔ "میں اکیلا ہی کیوں؟"

"یہ تمہارا ہی خیال تھا۔" اس نے کہا اور اس سے بڑھ کر چوہا تم ہی نے جار میں رکھا تھا۔"

اچانک میں قاتل بن چکا تھا!

اسی لمحے ہمیں اسکول کی گھنٹی سنائی دی اور اس ڈر سے کہ ہم لیٹ نہ ہو جائیں، ہم نے تقریباً دوڑ کر باقی کا راستہ طے کیا۔

اسمبلی ہال میں دعا ہوئی۔ ہم سب لڑکے قطاروں میں لکڑی کی بنچوں پر بیٹھے تھے جب کہ ہمارے اساتذہ سامنے پلیٹ فارم پر آرام کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ہم پانچوں لڑکوں نے جلدی جلدی اپنی جگہ بنائی۔ عین اسی وقت ہیڈ ماسٹر صاحب باقی اسٹاف کے ساتھ چلتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے۔

لینڈ آف کیتھیڈرل اسکول کے اساتذہ میں سے صرف ہیڈ ماسٹر ہی ہیں جنہیں میں یاد رکھتا ہوں اور اس کی وجہ آپ جلد جان جائیں گے۔ وہ میرے ذہن میں نقش ہیں۔ ان کا نام مسٹر کومبس تھا۔ وہ ایک بھاری بھرکم شخص تھے ان کے سر پر نسواری رنگ کے بالوں کے گچھے اگے ہوئے تھے۔ یوں تو بچوں کو بڑے دیو ہی لگتے ہیں لیکن ہیڈ ماسٹرز اور پولیس والے سب دیوؤں سے بڑے دیو ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے مسٹر کومبس عام شخص ہوں لیکن وہ مجھے دیو لگتے تھے جو ٹوئیڈ سوٹ میں ملبوس رہتے تھے جس کے اوپر انہوں نے کالا گون اور جیکٹ کے نیچے واسکٹ پہنے ہوتی تھی۔

مسٹر کومبس نے معمول کی دعا میں ہمارا ساتھ دیا اور پرانی دعا ایک ساتھ پڑھی لیکن اس صبح جب آخری آمین پڑھ لی گئی وہ خلاف معمول اپنے اسٹاف کے ساتھ ہال سے باہر نہیں گئے جس سے ظاہر ہوا کہ وہ کوئی اعلان کرنے والے تھے۔

"تمام طلباء باہر جا کر کھیل کے میدان میں فوراً قطار بنالیں۔" انہوں نے کہا۔

"کتابیں یہاں چھوڑ جاؤ اور خاموشی سے کھڑے رہو۔"

مسٹر کومبس سنجیدہ نظر آرہے تھے۔ اس کے فربہ گلابی چہرے پر خوف ناک تیوری چڑھی ہوئی تھی جو ایسے موقعوں پر ہوتی تھی جب وہ غصے میں ہوتے تھے۔

میں لڑکوں کی قطاروں میں گھچا مچھا ہو کر خاموش بیٹھا تھا اور اس لمبے کالے گون میں لپٹے ہیڈ ماسٹر، کسی جج کی طرح لگ رہے تھے جو کسی قتل کا کیس سننے جا رہے تھے۔

"ہیڈ ماسٹر صاحب قاتل کی تلاش میں ہیں۔" تھوئیس نے کانا پھوسی کی اور میں کانپنے لگا۔

"لگتا ہے پولیس کو بھی بلا لیا گیا ہے۔" تھوئیس نے بات جاری رکھی "اور جلاد باہر انتظار میں ہے۔"

گراؤنڈ کی طرف جاتے ہوئے مجھے لگا جیسے میرے معدے میں پانی گرداب کی صورت چکر لگا رہا ہے۔ میں تو صرف آٹھ سال کا ہوں، میں نے اپنے آپ سے کہا، کوئی آٹھ سال کا بچہ کسی کو قتل نہیں کرتا۔ یہ ممکن ہی نہیں، ستمبر کی اس گرم اور ابر آلود صبح کو گراؤنڈ میں پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب چیخ رہے تھے۔ "قطاروں میں کھڑے ہو جاؤ۔ چھٹی والے وہاں اور ان کے بعد پانچویں والے۔ پھیل جاؤ۔ جلدی کرو۔ بولنا بند کرو۔"

تھوئیس، میں اور ہمارے تینوں ساتھی دوسری فارم میں تھے، یعنی آخری سے پہلی اور ہم نے سرخ اینٹوں والی دیوار کے ساتھ قطار بنائی ہوئی تھی۔ ہم کندھے سے کندھا ملا کر کھیل کے میدان میں کھڑے تھے مجھے یاد ہے کہ جب اسکول کا ہر بچہ اپنی جگہ پر ہوتا تھا تو یہ قطار میدان کے چاروں طرف ہوتی تھی اور یہ تعداد تقریباً سو بچوں کی تھی۔ جن کی عمریں چھ سے بارہ سال کی تھیں اور سب بچوں نے ایک جیسی خاکستری رنگ کی نیکریں، خاکستری بلیزر، خاکستری جرابیں اور کالے بوٹ پہنے ہوتے تھے۔

"بولنا بند کرو۔" ڈپٹی ہیڈ چلایا۔ "مکمل خاموشی!"

لیکن آخر ہمیں گراؤنڈ میں اکٹھا کیوں کیا گیا تھا؟ میں نے سوچا اور ہمیں اس طرح قطاروں میں کیوں کھڑا کیا گیا تھا؟ پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا گیا تھا۔

میں نے تصور کیا کہ دو پولیس والے میری طرف بڑھے۔ مجھے بازوؤں سے پکڑا اور میری کلائیوں پر ہتھکڑی لگا دی۔

کھیل کے میدان کا ایک ہی دروازہ تھا۔ یہ اچانک کھلا اور موت کے فرشتے کی طرح ہمارے بھاری بھرکم، ٹوئیڈ سوٹ اور کالے گون میں ملبوس ہمارے ہیڈ ماسٹر ہماری طرف بڑھے اور ان کے پیچھے، یقین کریں، عین ان کے پیچھے، ننھی منی سی مسز پریشچٹ پھدکتی

ہوئی چلی آ رہی تھی۔
تو مسز پریچٹ زندہ تھی!
یہ بات انتہائی سکون آور تھی۔
''وہ تو زندہ ہے۔'' میں نے اپنے ساتھ کھڑے تھویس کے کان میں کہی۔
''میں نے اسے نہیں مارا!'' لیکن تھویس نے ان سنی کر دی۔
''ہم وہاں سے شروع کرتے ہیں۔'' مسٹر کومبس نے مسز پریچٹ سے کہا۔ اس نے مسز پریچٹ کو اس کے پتلے بازوؤں سے پکڑا۔ اور اسے چھٹی کلاس کے بچوں کی طرف لے گیا۔ پھر ہیڈ ماسٹر اس کے بازو کو پکڑے اسے تیزی سے دوسرے لڑکوں کی قطار کی طرف لے کر چلا۔ ایسا لگتا تھا جیسے فوجیوں کی انسپکشن ہو رہی ہو۔
''ان کو کیا مصیبت پڑی ہوئی ہے۔'' میں نے کانا پھوسی کی۔
تھویس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔
''یہ تو بڑے بچے ہیں۔'' میں نے مسز پریچٹ کو کہتے سنا۔ ''بہت بڑے ہیں۔ ان میں سے کوئی نہیں۔ کیوں نہ ہم چھوٹے بچوں کو دیکھیں؟''
مسٹر کومبس نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ ''ہمیں تمام بچوں کو دیکھنا چاہیے۔'' اس نے کہا۔ مسٹر کومبس کو بہت جلدی تھی۔ وہ فوری نتیجہ چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے مسز پریچٹ کی دبلی ٹانگیں تقریباً دوڑ رہی تھیں وہ اب تک کھیل کے میدان کے ایک حصے کو جہاں پانچویں اور چھٹی کے بچے کھڑے تھے، دیکھ چکے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ اب دوسری طرف جا رہے تھے اور پھر وہ تیسری طرف گئے۔
''یہ بھی بڑے ہیں۔'' مسز پریچٹ مینڈک کی آواز میں ٹرائی۔
''بہت بڑے ہیں! وہ چھوٹے بدمعاش کہاں ہیں؟'' اس نے بے چینی سے کہا۔ اب وہ ہمارے قریب آ رہے تھے۔ قریب اور قریب۔ اب وہ چوتھی سمت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جوں ہی وہ ہماری طرف آئے، ہماری کلاس کا ہر بچہ مسٹر کومبس اور مسز پریچٹ کو دیکھنے لگا۔
''یہ ننھے منے، بدمعاش، شرارتی۔'' میں نے مسز پریچٹ کو بڑبڑاتے ہوئے سنا۔ ''سمجھتے ہیں وہ میری دکان میں آ کر جو چاہے کریں۔''
مسٹر کومبس نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔
''مجھ سے نظریں چرا کر وہ......'' مسز پریچٹ نے بات جاری رکھی۔ ''اپنے گندے ہاتھ ادھر ادھر مارتے ہیں۔ انہیں کوئی تمیز ہی نہیں۔ لڑکیوں سے مجھے کوئی شکایت نہیں لیکن لڑکے بڑے گندے اور بدتمیز ہوتے ہیں۔ مجھے یہ باتیں آپ کو نہیں بتانی چاہئیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ایسا ہی ہے نا!''
''یہ چھوٹے بچے ہیں۔'' مسٹر کومبس نے کہا۔
میں نے دیکھا ان بچوں کے پاس سے گزرتے ہوئے مسز پریچٹ اپنی آنکھوں سے تیزی سے ان بچوں کو گھور رہی تھی۔
اچانک اس نے چیخ کر اپنی انگلی تھویس کی طرف اٹھائی اور وہ چلائی۔ ''یہ ہے وہ! یہ ان میں سے ایک ہے۔ میں اسے ایک میل کے فاصلے پر پہچان لوں گی۔ گندہ، غلیظ، بدمعاش۔''
اب سارا اسکول تھویس کو دیکھ رہا تھا۔
''م میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ مسٹر کومبس کو دیکھتے ہوئے ہکلایا۔ ''شٹ اپ'' مسٹر کومبس نے کہا۔ پھر مسز پریچٹ کی آنکھیں میرے اوپر مرکوز ہوئیں۔
میری نگاہیں جھک گئیں اور میں نے گراؤنڈ پر لکھے حروف تہجی پڑھنے شروع کر دیے۔
''اور یہ ایک اور رہا۔'' میں نے مسز پریچٹ کو چیختے ہوئے سنا۔ اب وہ میری طرف اشارہ کر رہی تھی۔
''تمہیں یقین ہے؟'' مسٹر کومبس نے پوچھا۔
''یقیناً یہ وہی ہے۔'' وہ چیخی۔ ''میں کبھی کوئی چہرہ نہیں بھولتی، کم از کم ایسا شریر چہرہ تو کبھی نہیں بھولتی۔ یہ ان میں سے ایک ہے۔ یہ پانچ کا گروہ ہے۔ اب باقی کے تین کہاں ہیں؟''
باقی کے تین۔ میں جانتا تھا ان کی باری بھی آنے والی تھی۔ باقی لڑکوں کی طرف نظر دوڑاتے ہوئے مسز پریچٹ کے چہرے پر اس کے اندر کا زہر جھلک رہا تھا۔
''یہ وہ رہے۔'' اس نے انگلی ہوا میں لہراتے ہوئے چلا کر کہا۔ ''یہ...... یہ...... اور یہ...... ٹھیک ہے۔ یہ رہے پانچ لڑکے۔ اس سے آگے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔'' ہیڈ ماسٹر صاحب یہ رہے سارے لڑکے۔ غلیظ۔ آپ کو ان کے ناموں کا پتا ہے۔ انہیں پکڑیں۔''
''مسز پریچٹ میں ان کا نام جانتا ہوں۔'' مسٹر کومبس نے جواب دیا۔ ''آپ کا شکریہ۔''
''اور میں بھی آپ کی بہت شکر گزار ہوں، ہیڈ ماسٹر صاحب۔'' اس نے جواب دیا۔ جب مسٹر کومبس مسز پریچٹ کو گراؤنڈ سے باہر لے جا رہا تھا ہم نے مسز پریچٹ کو کہتے ہوئے سنا۔ ''چوہا عین



گابز ٹاپرز کے جار میں تھا۔ مردہ بدبودار چوہا جسے میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔"

"مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے۔" مسٹر کومبس بڑبڑایا۔

"آپ صدمے کی بات کرتے ہیں۔" مسز پریٹچٹ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جب میری انگلیوں نے اس بدبودار، لجلجے مردہ چوہے کو پکڑا......" جیسے جیسے مسٹر کومبس، مسز پریٹچٹ کو گراؤنڈ سے باہر اسکول کی عمارت کی طرف لے کر چلا، مسز پریٹچٹ کی آواز ہوا میں تحلیل ہوتی گئی۔

☆☆☆

## کھوج لگائیے میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

زنیرا انور، محمد بن عمر، عدیل اللہ وسایا، علی حمزہ عبدالرشید، لاہور۔ محمد ابراہیم قاضی، راول پنڈی۔ فریدہ رفیق، چشتیاں۔ روحینہ رحمٰن، فیصل آباد۔ نور سحر، واہ کینٹ۔ سیف الرحمٰن، خوشاب۔ ملک ضیاء جتوئی۔ عدن سجاد، جھنگ۔ مسفرہ علی، خوشاب۔ محمد اسد شاہد، چشتیاں۔ زرش رضوان بٹ، لاہور۔ محمد احمد، بہاول پور۔ سبحان علی، گوجرانوالہ۔ عیشال عمران، سرائے عالم گیر۔ فلذا نعمان، کراچی۔ امان اللہ، گوجرانوالہ۔ عروبہ امین، کراچی۔ مریم کاشف، حیدر آباد۔ ملک مدثر ابراہیم، جھنگ۔ حیاء زہرا، پشاور۔ علینا اختر، کراچی۔ فرحین نوید، بھکر۔ محمد حسان عبداللہ، تلہ گنگ۔ محمد سلمان رضا قادری، کاموکی۔ محمد بلال صدیقی، کراچی۔ ماریہ حسن، لاہور۔ احمد علی، راول پنڈی۔ ایہا رامین، چکوال۔ مطیع اللہ، جڑانوالہ۔ مطیع الرحمٰن، لاہور۔ طٰہٰ یاسین، حیدر آباد۔ فروا طیب، لاہور۔ محمد طلحہ حمید، فیصل آباد۔ فیضان شاہد، اسلام آباد۔ محمد روشان، لاہور۔ حافظ صبغت اللہ، گوجرانوالہ۔ محمد احمد رضا، لاہور۔ محمد یحیٰی، ملتان۔ مدثر طاہر، راول پنڈی۔ محمد سعد، لاہور۔ سلمان یوسف سمیجہ، علی پور۔ دانش علی، اوکاڑہ۔ سائرہ سکندر، کراچی۔ محمد منیب ستار، سیال کوٹ۔ عبدالاحد، راول پنڈی۔ ہارون یوسف، لاہور۔ نعمان اکرم، اوکاڑہ۔ فارینہ فاطمہ، لاہور۔ محمد اسد شاہد، چشتیاں۔ فریدہ رفیق، چشتیاں۔ محمد ابراہیم، اسلام آباد۔ عیشہ فاطمہ، فیصل آباد۔ لائبہ فاطمہ، لاہور۔ محمد ابراہیم، سرگودھا۔ زہرہ ناصر، لاہور۔ ازکی نوید، لاہور۔ محمد حسان عبداللہ، تلہ گنگ۔ سید وقار اعظم، ملتان۔ تحریم نور، گجرات۔ محمد معاذ مصطفوی، بہاول پور۔ ہمائشہ اشفاق، راول پنڈی۔ تحریم نور، گجرات۔ یاسر محمود، لاہور۔ فضہ گل، نوشہرہ۔ عائشہ قمر، گوجر خان۔ راج ولی خان، نوشہرہ۔ حفصہ اسماء، عبداللہ۔ واہ کینٹ۔ ملک محمد احسن، راول پنڈی۔ ماہ نور فاطمہ، میانوالی۔ میمونہ نوید، راول پنڈی۔ راجہ مرتضٰی خورشید علی، سرگودھا۔ تطہیر زہرہ، اسلام آباد۔ ماہیرہ اکرم، لاہور۔ محمد سالار، گوجر خان۔ حفصہ اعجاز، باڑہ ہملٹ۔ ایمن کائنات، ڈیرہ غازی خان۔ ملیحہ شہباز، بورے والہ۔ محمد عمر اشرف آرائیں، کبیر والا۔ عفت سراج، ڈیرہ غازی خان۔ محمد نعمان رضا قادری، خدیجہ نشان، محمد اسد عبداللہ قادری، محمد ابوبکر عارف قادری، حسن رضا سردار وصفی، کاموکی۔ زین لیاقت، لاہور۔ سعید مظہر، کراچی۔ فراس طیب، لاہور۔ آمنہ عثمان، راول پنڈی۔ عائشہ اکمل، ڈیرہ غازی خان۔




ایک تھا بندر۔ اس کے سر پر تھا سونے کا بال۔ ایک دن اس کے سر میں ایک کانٹا چبھ گیا۔ وہ گیا نائی کے پاس اور اس سے کہا۔
”نائی نائی! میرے سر میں سے یہ کانٹا نکال دے۔“

نائی نے کہا۔ ”بھائی! کانٹا تو میں نکال دوں گا مگر تیرے سر میں سونے کا جو بال ہے، وہ کٹ جائے گا۔“

بندر نے کہا۔ ”میری بلا سے، تیری بلا سے، دو چار کی اور کی بلا سے۔ کٹ جائے گا تو کٹ جائے۔“

نائی نے لے استرا بندر کے سر میں سے کانٹا نکال دیا مگر اس کے ساتھ ہی سونے کا بال بھی کٹ گیا۔ بندر نے نائی کا استرا اٹھا لیا۔

نائی نے کہا۔ ”بھئی! یہ کیا؟ میرا استرا تم نے کیوں لے لیا؟“

بندر نے کہا۔ ”بھئی سن! میرا سونے کا بال تیرے پاس۔ تیرا استرا میرے پاس۔“

استرا لے کے بندر چلا جاتا تھا کہ راستے میں اسے ایک گھسیارا ملا۔ گھسیارا ہاتھ سے گھاس اکھاڑ رہا تھا۔ بندر نے کہا۔ ”میاں گھسیارے! تم ہاتھ سے گھاس کیوں اکھاڑ رہے ہو؟ لو یہ میرا استرا۔ اس سے گھاس کاٹ لو۔“

گھسیارے نے کہا۔ ”بھئی! تیرا استرا ٹوٹ جائے گا۔“

بندر نے کہا۔ ”میری بلا سے، تیری بلا سے، دو چار کی اور کی بلا سے۔ ٹوٹ جائے گا تو ٹوٹ جائے۔“

گھسیارے نے استرا لے لیا اور اس سے گھاس کاٹنا شروع کی۔ گھاس کاٹتے کاٹتے استرا ٹوٹ گیا۔ بندر نے گھسیارے کا کمبل اٹھا لیا۔ اس نے کہا۔ ”بھئی! یہ کیا؟ تم نے میرا کمبل کیوں اٹھا لیا؟“

بندر نے جواب دیا۔ ”بھئی سن! میرا سونے کا بال نائی کے پاس۔ نائی کا استرا میرے پاس۔ میرا استرا تیرے پاس۔ تیرا کمبل میرے پاس۔“

آگے چلا تو ایک بنیا ملا جو زمین پر رکھ کر گڑ توڑ رہا تھا۔ بندر نے کہا۔ ”میاں! اس طرح تمہارا تمام گڑ خراب ہو رہا ہے۔ لو میرا یہ کمبل۔ اس پر رکھ کر گڑ توڑ لو۔“

بنیے نے کہا۔ ”بھئی! اس طرح تمہارا کمبل خراب ہو جائے گا۔“

بندر نے کہا۔ ”میری بلا سے، تیری بلا سے دو چار کی اور کی بلا سے۔ خراب ہوتا ہے تو ہونے دو۔“



بنیے نے کمبل لے لیا اور اس پر رکھ کر گڑ توڑنے لگا۔ گڑ لگنے سے کمبل خراب ہوگیا۔ بندر نے بنیے کا سارا گڑ اٹھا لیا۔

بنیے نے کہا۔ ''بھئی! یہ کیا؟''

بندر نے جواب دیا۔ بھئی سن! میرا سونے کا بال نائی کے پاس۔ نائی کا استرا میرے پاس۔ میرا استرا گھسیارے کے پاس۔ گھسیارے کا کمبل میرے پاس۔ میرا کمبل تیرے پاس۔ تیرا گڑ میرے پاس۔

بنیا چپ ہو رہا۔ آگے چلا تو اسے ایک بڑھیا ملی جو بیٹھی پکوان پکا رہی تھی۔ بندر نے اس سے ایک گلگلہ مانگا۔ بڑھیا نے اٹھا کے دے دیا۔ اسے کھا کر بندر بولا۔ یہ تو پھیکا ہے۔ تم میرا یہ گڑ ڈال لو۔''

بڑھیا نے کہا۔ نا بھائی! تمہارا گڑ ختم ہو جائے گا۔''

بندر نے کہا۔ ''میری بلا سے، تیری بلا سے، دو چار کی اور کی بلا سے۔ ہو جائے ختم۔''

بڑھیا نے اٹھا کر آٹے میں سارا گڑ ملا لیا۔ جب پکوان تل چکی تو بندر اس کا سارا پکوان اٹھا کر بھاگنے لگا۔ بڑھیا نے کہا۔ ''ہیں! یہ کیا؟''

بندر نے کہا۔ ''مائی سن! میرا سونے کا بال نائی کے پاس۔ نائی کا استرا میرے پاس۔ میرا استرا گھسیارے کے پاس۔ گھسیارے کا کمبل میرے پاس۔ میرا کمبل بنیے کے پاس۔ بنیے کا گڑ میرے پاس۔ میرا گڑ تیرے پاس۔ تیرا پکوان میرے پاس۔'' بڑھیا چپ ہو رہی۔

آگے چلا تو ایک بارات ملی۔ بندر نے کہا۔ ''کیسی بارات ہے۔ سب سوکھے منہ چلے جا رہے ہیں۔ اگر کچھ اور نہیں تو باراتیوں کو یہ پکوان ہی کھلاؤ۔'' سب نے کہا۔ ''نا بھائی! تیرا پکوان ختم ہو جائے گا۔''

بندر نے جواب دیا۔ ''میری بلا سے، تمہاری بلا سے، دو چار کی اور کی بلا سے۔ ختم ہو جائے۔''

باراتیوں نے بندر کا پکوان کھانا شروع کر دیا۔ جب پکوان ختم ہو گیا تو بندر ڈولے میں سے دلہن کو نکال چلتا بنا۔ تمام لوگ دوڑے۔ ''ہائے! ہائے! دوڑو پکڑو، دیکھو غضب ہو گیا۔ بندر دلہن کو لیے جا رہا ہے۔''

بندر نے کہا۔ ''بھائیو سنو! میرا سونے کا بال نائی کے پاس۔ نائی کا استرا میرے پاس۔ میرا استرا گھسیارے کے پاس۔ گھسیارے کا کمبل میرے پاس۔ میرا کمبل بنیے کے پاس۔ بنیے کا گڑ میرے پاس۔ میرا گڑ بڑھیا کے پاس۔ بڑھیا کا پکوان میرے پاس۔ میرا پکوان تمہارے پاس۔ تمہاری دلہن میرے پاس۔''

لوگوں نے کہا۔ ''مارو اس بدمعاش بندر کو۔''

بندر نے جب دیکھا کہ میری بات نہیں چلتی تو چڑ چڑ کرتا ہوا کوٹھے پر چڑھنے لگا مگر ٹانگ پھسل گئی اور وہ بھد سے نیچے گر پڑا۔ اب تو یہ حالت تھی کہ کوئی اس کے جوتا مارتا، کوئی چپت رسید کرتا، کوئی لاتوں سے تواضع کرتا۔ غرض مارتے مارتے بندر کا اُتو بنا دیا۔ اسی مار پٹائی میں بندر کی ایک آنکھ پھوٹ گئی، ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اور وہ بڑی مشکل سے باراتیوں کے ہاتھ سے اپنی جان بچا کر بھاگا۔ جب اپنی برادری میں پہنچا تو سب نے لعنت ملامت کی اور کہا۔ ''کم بخت جھوٹ اور لالچ کا انجام دیکھا؟''

بندر نے توبہ کی، کانوں کو ہاتھ لگائے اور پھر کبھی کوئی برا کام نہیں کیا۔ ☆☆☆



# بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10/ مارچ 2018ء ہے۔



فروری 2018ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- بلی ہے عیار صبح 5 بجے کچن میں داخل ہوکر، مچھلیاں دو ہیں اور مار کھائے گی کالی مرچ ڈال کر (محمد سالار، گوجر خان
- سانجھے چبوترے تھے، محبت تھی، گیان تھا وہ رکھ رکھاؤ کیا ہوا، تہذیب کیا ہوئی (سیدہ سائرہ سکندر، کراچی)
- کھانا کھلا رہی ہوں تندرست بنانے کے لیے عمدہ غذا بنو گے میرے کھانے کے لیے (ماہین صباحت، لاہور)
- کسی کی جاں نکل جائے شرارت یوں نہیں کرتے (تسکین فاطمہ، بھکر)
- پیدا نہ کر سکے تیرے کردار کی مثال دکھلائے شیر کی خالہ نے طرح طرح کے کمال (محمد معاذ مکی، بہاول پور)

# ہونہار مصور

## باغ اور مالی

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔



سلمان یوسف سمیجہ، علی پور (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)



حافظ محمد زید، کمالیہ (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)



زنیرہ بانو، کمالیہ (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)



زہرا شاہد، سرگودھا (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)



کونین تنویر، لاہور (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

**کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:** میمونہ نوید، راول پنڈی۔ عیشال عمران، گجرات۔ ثانیہ ملک، گوجر خان۔ محمد دانیال نواز، اسلام آباد۔ حسان علی کیانی، کراچی۔ فاتحہ نور، مظفر گڑھ۔ سعدیہ منشاء، سائرہ عبدالغفار، لاہور۔ عائشہ ارشد، صباء اسلم، لائبہ سلیم، رمشا حنیف، لاہور۔ لائبہ مشتاق، خوشاب۔ عائزہ انجم، راول پنڈی۔ حیاء زہرا، پشاور۔ فضہ گل، نوشہرہ۔ رمشا شبیر، لاہور۔ کظیمہ زہرہ، کراچی۔ حاجرہ کیانہ، راول پنڈی۔ طوبیٰ رفیق، گجرات۔ ارسلان طیب، ملتان۔ سالار علی، گوجرانوالہ۔ ثمینہ تحریم، ڈیرہ غازی خان۔ صدیق حفیظ، لاہور۔ طارق جلیل، رحیم یار خان۔ صنم لطیف، بہاول پور۔ عمران ظہیر، کراچی۔ کامران اصغر، لاہور۔ بشریٰ ناز، منڈی بہاؤ الدین۔ عامرہ اصغر، لاہور۔ فصیحہ فاطمہ، پشاور۔ مومن اسلام، کراچی۔ عبداللہ رحمان، گجرات۔ محمد احمد، محمد حسن، کوئٹہ۔ ربیعہ رحمان، راول پنڈی۔ عائشہ قمر، لاہور۔ ایمان فاطمہ، ڈیرہ غازی خان۔

**ہدایات:** تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

مارچ کا موضوع
ہوائی اڈہ
آخری تاریخ 8 مارچ

اپریل کا موضوع
فٹ بال میچ
آخری تاریخ 8 اپریل